

غالب کا ذوقِ الہیات

سید مشکور حسین یاد



غالب کا ذوقِ الہیات

(روشن خیالی اور حریت فکر کے حوالے سے)

سید منکھور حسین یاد

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

ذوالفقار علی شیخ

نٹار آرٹ پریس لاہور

ستمبر 1999ء

مکان نمبر 263 گلی نمبر 9

کیولری گراؤنڈ لاہور

ناشر

مطبع

پاراول

مقام اشاعت

انتساب

ہر آزاد خیال اور روشن ضمیر انسان

کے

نام

سنگینہ معنی کا ظلم اس کو سمجھے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے
غالب

ترتیب

7	دیباچہ
22	حسن دیباچہ
26	پیرہن کائنات
30	حریت فکر اور اہلیات
35	کفر و ایمان کی کشمکش
39	تہذیب چھٹا کیا
47	بات چہنی تری جوانی تک
53	مکلاؤ ثواب کی غذا کھیں
58	عالم کی ایک غزل
79	اہلیات کی چار صورتیں
92	نیمہ اس کی ہے دماغ اس کا ہے
97	کہے کس منہ سے جلاؤ گے عالم
101	راست پی نہ حرم پر سے
105	شوق فضول
111	طرہ بجائے غم بہ طم

115	پہاڑی عمل
120	بچاؤ کی غلطی
124	بھلائی کے نئے میں
128	مازخود آرا
133	غالب کی ولایت سخن
141	قلم کار و سر اقدم
145	بند کی سر چشمہ آزادی و فکر و عمل
149	بھر کیا چاہئے
156	اصل ایمان
162	سے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا
168	آراکش جمال
173	باطن لہو لہان
177	انتظامی تصویر ایثار
182	نغمہ خوار جان و رو و مند

میں غالب کی الیمات کے بجائے اس کے ذوق الیمات پر اس لیے بات کرنا چاہتا ہوں کہ الیمات سے یعنی اللہ اور اس کی ذات سے تو ہر انسان کا تعلق ہوتا ہے لیکن یہ تعلق کس قسم کا ہے اس سے ہر انسان کی انسانیت کا پتا چلتا ہے۔ بس اسی پتا چلنے کو میں نے یہاں ذوق الیمات کا نام دیا ہے۔ گویا غالب کے ذوق الیمات سے میری مراد یہ ہے کہ غالب بہ حیثیت شاعر حقیقت عقلی کے ساتھ کس طرح کا تعلق قائم رکھتا ہے اور کس طرح وہ اس تعلق کو روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرتا ہے۔

میں نے اپنی مکتلو کو غالب کی اردو شاعری تک خاص طور سے اس لیے محدود رکھا ہے کہ غالب کے اردو دیوان کے بیشتر اشعار اس کے لڑکپن یا یوں کہہ لیجئے کہ اس کی اضنی جوانی اور زمانہ شباب سے تعلق رکھتے ہیں۔۔۔۔۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ویسے تو ہر شخص کی اپنی ایک المیات ہوتی ہے یعنی ہر شخص کسی نہ کسی نوع کا اللہ اور اس کی ذات سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ اللہ سے تعلق ہر انسان کی انسانیت یا ہر آدمی کی آدمیت کے

ساتھ سب سے زیادہ نفوس تعلق ہوتا ہے۔ آدمی میں ذرا شعور پیدا ہوا سمجھ لیجئے اس کا اللہ سے تعلق بھی اسی طرح نفوس انداز میں نمود پذیر ہونے لگا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ جیسے ہی آدمی کو اپنے گرد و پیش میں اس کی کسی مشکل یا الجھن کو دور کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا تب وہ بے ساختہ طور پر کسی کو اپنی مدد کے لیے پکارتا ہے تو فوراً اس کا اللہ سے ایک نفوس قسم کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔

ہر آدمی کی فطرت میں یہ بات ایک توانائی اور طاقت کی صورت میں موجود ہے کہ اس کی یہ زندگی کوئی معمولی چیز نہیں اور اس زندگی کے غیر معمولی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ بغور دیکھیں تو ہزار درد و الم کے باوجود کسی آدمی کی زندگی لاوارثوں کی طرح نہیں لگتی۔ کسی نہ کسی انداز سے اسے یقین ہوتا ہے کہ اگر اس کے سامنے کوئی مشکل آتی ہے تو اس مشکل کا کوئی نہ کوئی مشکل کشا بھی ضرور ہے۔۔۔۔۔ وہی بات کہ مدد کے لیے کسی ایسی ذات کو پکارتا جو سامنے نظر نہیں آ رہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ذات نظر آنے والی اشیاء سے بلند و برتر ہے اور اسی لیے حلال مشکلات بھی ہے۔۔۔۔۔ گویا آدمی میں ادھر ذرا شعور پیدا ہوا ادھر وہ حقیقت الحقائق کو اپنے تجربہ احساس میں لانے لگا۔۔۔۔۔ آدمی اللہ کو اپنے تجربے میں تو آسانی سے لے آتا ہے لیکن ساری خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ یقینی آدمی اللہ کو اپنے تصور میں بھی لانا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ صحیح معنی میں عقل مند لوگ اللہ سے نفوس تعلق تو ہمیشہ قائم رکھتے ہیں لیکن اسے تصور میں لانے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔۔۔۔۔ غالب نے اپنی شاعری میں یہی کمال دکھایا ہے کہ اللہ سے اپنا تعلق تو نفوس قسم کا قائم رکھا ہے لیکن اسے اپنے تصور میں لانے کی کبھی

کو شش نہیں کی۔۔۔۔۔

غالب کے فارسی کلام میں تو آپ کو غالب کے ذوق المیات کے بہت سے کلمات نظر آئیں گے ہی اردو کلام میں بھی (جب کہ یہ کلام نسبتاً اس کی ابتداء عمر کا ہے) ذوق المیات کے جلوے عام نظر آتے ہیں۔ غالب کے اردو دیوان میں شاید ہی ایسی کوئی غزل نظر آئے جس میں غالب کے شعور یا لاشعور میں اللہ کا ذکر موجود نہ ہو۔۔۔۔۔ یاد رہے میں نے یہاں اللہ کا خیال یا تصور نہیں کہا اللہ کے ذکر کی بات کی ہے۔ ایسا لگتا ہے غالب کو ہر لمحے اللہ کا احساس رہتا ہے اور میں اسی کو اللہ سے مضبوط اور ٹھوس تعلق کا ثبوت دیا کرتا ہوں۔۔۔۔۔ اب رہا یہ سوال کہ غالب کو اللہ یاد آتا ہے تو اس کی عام زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ ایک بالکل الگ سوال ہے لیکن یہ سوال جتنا ہدایت دہانہ حیثیت کا حامل ہے اتنی ہی ہمارے نفس مضمون سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر غالب کو ہر وقت اللہ کا احساس رہتا تھا تو وہ کوئی عام مضمون میں خدا رسیدہ یا صوفی یا درویش صفت انسان تھا۔ یہی تو لطف کی بات ہے کہ غالب خدا کا گہرا شعور رکھتے ہوئے بھی ایک عام گوشت پوست کا آدمی تھا۔ عام انسان جو زندگی کے ہر طرح کے علاقوں میں گہرا ہوا ہے۔ لیکن غالب کے عام آدمی پن کو غالب کے عقل و شعور نے طرح طرح کے لطائف حیات سے بہرہ ور کیا ہے۔ اپنے ذوق المیات کے باعث غالب عام آدمی ہونے کے باوجود زندگی کے بے شمار لذائذ اور اندوہ و الم کے ذائقوں سے آشنا ہوتا رہا۔ اللہ کا پورا پورا احساس رکھتے ہوئے ایک آدمی اپنی عمر چند روزہ کی وسعتوں گہرائیوں اور بلندیوں سے کس طرح فیض یاب ہو سکتا ہے اس حقیقت کو کوئی غالب سے پہچھے۔

اصل میں غالب کے ذوق الہیات کا کمال یہ ہے کہ وہ الہیات کو کچھ اپنے ہی انداز میں فروغ دیتا ہے۔ اس ضمن میں جو کام بڑے بڑے صوفیاء کرام اور اولیاء اللہ سرانجام نہ دے سکے وہ کام غالب اپنے اشعار کے ذریعہ طرح طرح سے انجام دیتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہاں پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر الہیات کو فروغ دینے کا فائدہ کیا ہے۔ جب کہ موجودہ دور میں تو دین و مذہب کو ایک طرح ترقی یافتہ اقوام چھوڑی چکی ہیں۔۔۔۔۔۔ جی ہاں ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بظاہر ایسا ہی ہے لیکن عمد حاضر کے جدید ترین فلسفوں کو اور فلسفیانہ نظریات کو توجہ سے دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان سب کے اندر سے کس طرح الہیات کے کوئڈے لپک رہے ہیں۔ آدمی اللہ کے احساس کے بغیر اس لیے زندہ نہیں رہ سکتا کہ ہزار انسان کی عمر چند روزہ ہو لیکن وہ اس چند روزہ عمر کو بھی بے کراں ہو کر گزارنا چاہتا ہے اور اللہ کے ذکر و فکر کے بغیر اس چند روزہ زندگی میں بے کرائی پیدا نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔۔ چند روزہ زندگی کے بے شمار امکانات کو روشن کرنے کے لیے اللہ کا احساس کرنا یا اللہ کو اپنے تجربے میں لانا ایک طرح انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

گویا آزاد خیال اور روشن ضمیر انسان اللہ کو سب سے زیادہ یاد رکھتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ جس قدر اللہ کو یاد رکھنے سے انسان میں آزاد خیالی اور روشن ضمیری پیدا ہوتی ہے اسی قدر نام نہاد اہل دین اور والہان مذہب نے اللہ کی یاد کو ایک طرح کا تعصب اور تنگ دلی و تنگ نظری بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ اہل دین اور اہل مذہب اللہ کو تصور میں لا کر اسے محدود کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور اللہ کی یاد سے جو وسعتیں گمرائیاں اور بلندیاں وابستہ ہیں انہیں فراموش کر دیتے ہیں۔ جس

طرح آزاد خیالی اور روشن ضمیری اللہ کے ذکر اور اس کی یاد سے الگ کوئی چیز نہیں ہے اسی طرح ہم اللہ کو فراموش کر کے کسی طرح بھی آزاد خیال اور روشن ضمیر نہیں بن سکتے۔۔۔۔۔ غالب کے ذوق الہیات نے سب سے بڑا کام یہی کیا ہے کہ ہمیں غالب کے اشعار میں آزاد خیالی اور روشن ضمیری کی نئی سے نئی صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔۔۔۔۔ آزادی خیالی اور روشن ضمیری کا جدید سے جدید تصور لے آئے وہ آپ کو غالب کے اشعار میں ملے گا اور اپنی پوری جدت طرازی اور ندرت افروزی کے ساتھ۔۔۔۔۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ ہم اللہ کو یاد کرتے ہیں تو لاشعوری طور پر ایک عجیب پرہوش تخلیقی فضا سے ہمارا پر راوجود سرشار ہو جاتا ہے۔ حرکت و عمل کا ایک انوکھا سا ماحول ہمیں اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ لاشعوری طور پر میں نے اس لیے کہا ہے کہ اللہ کا احساس کا تجربہ تو ہر شخص کو ہو جاتا ہے لیکن اسے شعور میں لانے کے لیے انسان کا عقل مند ہونا یا صاحب فکر ہونا بہت ضروری ہے اور اچھی عقل اور اچھی فکر ہر ماحول شخص کے پاس ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے اس احساس کو اپنے شعور میں لا سکتا ہے۔ یہ پھر ایک الگ مسئلہ ہے کہ بڑے صاحبان عقل اور صاحبان فکر اللہ کے احساس کو اپنے شعور میں نہیں لاتے اور فقط نظریات تراشتے رہتے ہیں۔ یونانی فکر کی سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ اس نے صاحبان عقل کو عمل اور تجربہ سے دور کر کے عقل سوچ بچار کا اسیر بنا کر رکھ دیا۔۔۔۔۔ غالب کے اشعار میں عمل کا پہلو قریب قریب ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ فکر کے پہلو پہ پہلو ہمیں غالب کے اشعار میں ایک حیات پرور تحرک بھی نظر آتا ہے۔ بلکہ اگر شاعرانہ نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو غالب کی شاعری میں فکر و عمل سے ایک بہت ہی حقیقت پسندانہ لیکن

پر کیف آہنگ پیدا ہوا ہے جو بیک وقت ہمیں عمل کے لیے بھی اکساتا ہے اور فکر کے لیے بھی حتمہ کرتا ہے۔ فکر و عمل کے اس آہنگ سے غالب کے اشعار میں جو ایک تہائی کیفیت پیدا ہوئی ہے اس کی معمولی سی ایک موج حسن پرور ہمیں کسی دوسرے ہی عالم میں لے جاتی ہے جس کو ہم اپنے اس عالم کے امکانات کی ایک تازہ صورت کا نام دے سکتے ہیں۔ اور یہ سب برکتیں ہیں غالب کے ذوق المیات کی کہ غالب حقیقت المیات کو کبھی اپنے ذہن سے الگ نہیں ہونے دیتا۔

ایک دن ایک صاحب بڑے غصے میں آ کر طویہ انداز میں مجھ سے پوچھنے لگے ”منکھور بچ بچ بتاؤ تمہیں غالب کے اس شعر میں اس کے ذوق المیات کا کون سا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔“

اسد خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
 کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داپ تو دے
 میں نے کہا دیکھو بھائی اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو جیسے ہی اس کے
 معشوق نے پاؤں دابنے کی فرمائش کی تھی وہ فوراً ”پاؤں دابنے شروع کر
 دیتا۔۔۔۔۔ پاؤں دابنے کی معشوقانہ فرمائش پر اس کے ہاتھ پاؤں کبھی نہ
 پھولتے۔

وہ صاحب بولے ”گویا منکھور تم کہنا یہ چاہتے ہو کہ غالب کے ذوق
 المیات نے اس کے معشوق کی پاؤں دابنے والی فرمائش پر اس کے یعنی غالب
 کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے۔“

میں نے کہا ”اگر آپ اسے غیر سنجیدگی سے نہ لیں تو میں عرض کروں
 گا کہ بات کچھ ایسی ہی ہے۔“

”یعنی تم بہت ہی سیدھی سادھی زبان میں یہ بتانا چاہتے ہو کہ اللہ نے غالب کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے اور وہ بھی معشوق کے صرف اتنا کہنے پر ”ذرا میرے پاؤں داب تو دے۔“ تم نے لفظ ذرا پر غور کیا ہے؟“

”جی ہاں یہی لفظ ذرا تو اس شعر کا کلیدی لفظ ہے۔“

”ارے میاں چھوڑو ہمیں کیوں بے وقوف بنا رہے ہو۔ معشوق کی بے اعتنائی کا تو یہ عالم ہے کہ پاؤں دابنے کے لیے بھی ذرا کا لفظ استعمال کر رہا ہے یہ نہیں کہہ رہا کہ اچھی طرح میرے پاؤں داب اور تم ہو کہ خوش ہو رہے ہو اور کہہ رہے ہو کہ لفظ ذرا اس شعر کا کلیدی لفظ ہے۔“

”یقیناً“ یہ لفظ اس شعر کا کلیدی لفظ ہے۔“

”وہ کس طرح؟“

”وہ اس طرح کہ ذرا کے لفظ سے جو بے تکلفی اور چٹانگت نکلتی رہی ہے وہ کسی دوسرے لفظ سے کسی طرح بھی واضح نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔ اور اسی لفظ ذرا نے اسد کے ہاتھ پاؤں خوشی کے مارے پھلا دیے اور اور اسی لفظ ذرا سے اسد یعنی غالب کو پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ اس کا معشوق اسے کس قدر اپنا سمجھتا ہے اور وہ اس سے کس قدر باطنی طور پر قریب ہے۔ اور کس قدر اسد پر وہ اپنا حق رکھتا ہے کہ ایک لفظ ذرا سے زیادہ کے معنی کا مفہوم ادا کر رہا ہے کیا آپ اپنے کسی بے تکلف دوست کو جب کوئی کام کرنے کو کہتے ہیں تو اس طرح نہیں کہتے یا ذرا تم میرا یہ کام کرو؟“

”چلو بھائی تمہاری یہ سب باتیں درست لیکن یہاں غالب کا ذوق امیات کس طرح اس کے معشوق کے پاؤں میں آدھکا۔۔۔۔۔ اور اللہ میاں کی یاد نے اس ضمن میں کون سا معجزہ دکھایا ہے؟“

میں نے کہا ”اصل میں میرے بھائی آپ کے لیے یہ بات ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے کہ بھلا اللہ میاں کی یاد کا معشوقوں کے معاملات سے کیا تعلق؟ یا ذوق امیات کا عاشق و معشوق سے کس طرح کوئی رشتہ قائم کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔۔ وہی بات کہ کہاں ذوق امیات کہاں معشوق کے پاؤں؟ پھر دوسری طرف آپ یہ بھی مانتے ہیں کہ اللہ اپنے بندوں کے ایک ایک فعل کو اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے ہے۔ گویا اللہ کی نظر میں اس کے بندوں کا کوئی فعل بھی غیر اہم نہیں ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ آزاد خیالی اور روشن ضمیری کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے ایک ایک فعل کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو اور آدمی کو اپنی نقل و حرکت کے بارے میں اس قدر آگاہی اللہ کی یاد کے بغیر بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ”ذرا میرے پاؤں داب تو دے“ کہنے سے جو خوشی حاصل ہوئی اور اس خوشی کے حاصل ہونے سے جو عاشق کے ہاتھ پاؤں پھولے یہ ساری کیفیت گویا ایک دعا کے قبول ہونے کی کیفیت قرار دی جاسکتی ہے۔ جس نے عاشق کو اپنے معشوق سے قریب تر کر دیا ہاں اس قربت میں شاید ہم اللہ کی ذات کو فراموش کرنے کی گستاخی تو کر سکتے ہیں لیکن اس کی ذات کے الخاف و کرم سے انکار نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔۔ آج کے جدید ترین ذہن کے آدمی کو یہ بتانے اور جتانے کی بے حد ضرورت ہے کہ اگر کوئی ذات ہمارے لہذا لہذا اور آسانکس کا صحیح معنی میں خیال کرتی ہے اور جس طرح اُمیں اپنی نگاہ میں رکھتی ہے وہ صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے۔ سچ پوچھئے تو غالب نے اپنے ذوق امیات سے یہی کام تو خوب لیا ہے جس کی ایک مثال ہم نے پاؤں دہانے والے غالب کے اس عمدہ شعر کے ذریعہ ابھی ابھی پیش کی ہے۔ جس کو ہمارے شارحین نے بہت معمولی سا بلکہ فحش شعر قرار دیا ہے۔ اب ایک دوسری مثال

بھی لہجے اور غالب کے ذوق الہیات کی وسعتیں ملاحظہ فرمائیے۔

ہاں تو دیکھئے مندرجہ ذیل شعر میں غالب نے اپنے ذوق الہیات کے حوالے سے کس طرح انسان کو حریت فکر و عمل کی دعوت بے پناہ سے سرفراز کیا ہے۔

جب کرم رخصت ہے ہاکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز غفلت تقصیر نہیں

لیکن ہمارے شاد حسین غالب نے اس شعر کو بھی وسیع تاثر میں دیکھنے کے بجائے محض ایک عام محبوب یا معشوق کی ایک خاص مہربانی تک محدود کر کے اس کی تشریح فرمائی ہے۔۔۔۔۔ جب کہ غالب نے اس شعر میں لفظ کرم کو وسیع ترین معنی میں استعمال کیا ہے اور پھر اپنے ذوق آفرینی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے لفظ کرم کی تمام جہات معنوی پر روشنی ڈالی ہے۔۔۔۔۔ یہ صحیح ہے کہ جس طرح ہمارے شاد حسین فرماتے ہیں کہ جب کوئی معشوق اپنے عاشق کو مکمل کیلئے کی خود اجازت دے رہا ہو تو پھر بھی اگر کوئی عاشق اپنے آپ کو رحمان تکلف سے ہاندھ کر کھڑا رکھے تو اس سے زیادہ بڑی اس کی کوتاہی اور حقیر کیا قرار دی جاسکتی ہے۔ لیکن ہم بھول شاد حسین اگر اس شعر کے معنی کو معشوق مجازی تک ہی محدود کر دیتے ہیں تو پھر یہ شعر معنوی اعتبار سے جنسی معاملات سے آگے نہیں بڑھتا۔

ذرا سوچئے تو سہی عام معشوقوں میں سے کون معشوق ایسا ہے جو تھوڑی بہت منت سماجت کے بعد رخصت ہے ہاکی و گستاخی سے اپنے عاشق کو باغ و بہار نہیں کر دیتا۔۔۔۔۔ ہمارے مولانا غلام رسول مرے بہت زور مارا تو اس شعر کے معنی کو یہاں تک پہنچایا ہے۔۔۔۔۔ فرماتے ہیں

”شعر میں دراصل اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ اصل شے محبوب کی رضا اور خواہش ہے۔ گناہ وہی ہے جو محبوب کی رضا کے خلاف ہو جن امور کو اس نے از راہ لطف و نوازش گناہوں سے خارج کر دیا ان کا نہ کرنا یقیناً ”گناہ سمجھا جانا چاہئے۔۔۔۔۔“ ایک تو معلوم نہیں ہمارے شاعرین کو کیا ہو گیا ہے کہ عاشق و معشوق ایسے حسین و نازک رشتوں میں بھی گناہ کا ذکر اس طرح لے کر آتے ہیں جیسے عاشق ہو نایا معشوق ہو نا ہی سب سے بڑا بنیادی گناہ ہے۔ ہو سکتا ہے عشق و حسن کے معاملات میں شیطان کی طرح گناہ بھی کسی راہ سے چھپ چھپا کر گھس آتا ہو لیکن اس شعر میں تو غالب گناہ و ثواب سے بلند ہو کر ایک بات کہہ رہا ہے جس کا انسان کی آزاد خیالی اور روشن ضمیری سے براہ راست تعلق ہے اور تعلق بھی بڑا مضبوط اور ٹھوس قسم کا۔۔۔۔۔

مطلب یہ ہے کہ غالب اس شعر میں اپنے ذوق امیات کے بل بوتے پر کہتا ہے کہ اللہ کی طرف سے آدمی پر نہ کوئی سوچنے کی پابندی ہے اور نہ اس پر عمل کی کوئی قید۔۔۔۔۔ وہ جو چاہے سوچ سکتا ہے اور جو چاہے عمل کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن غالب کی بات کو تسلیم کرنے سے پہلے ہمیں اس پر پوری طرح توجہ دینی چاہئے کہ حریت فکر و عمل ہے کیا؟ اور اس کو کس طرح تجربہ میں لایا جاسکتا ہے؟ آئیے ہم غالب ہی کے بتائے ہوئے ایک گر کے مطابق زیر بحث شعر کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے ہیں۔۔۔۔۔ یقیناً ”ہمیں اس طرح چٹا چٹے کا کہ کیسے غالب کا ایک ایک لفظ بچوں کی طرح ہماری انقلی پکڑ کر ہمیں معافی کے نئے نئے راستوں پر لے جاتا ہے۔ شعر زیر بحث کو ذہن میں رکھنے کی خاطر اسے پھر ذیل میں تحریر کیا جا رہا ہے۔

جب کرم رخصت ہے ہاکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز ثبوت تقصیر نہیں

اس کی تشریح یوں ہوتی ہے۔ جب کرم نے یعنی سب سے بڑے معشوق
نے اپنے عاشقوں کو بے ہاکی و گستاخی کی عام اجازت دے رکھی ہے تو پھر ایسی
صورت میں اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو اس سے بڑھ کر کوئی کوتاہی کیا ہو
سکتی ہے۔ بلکہ یہ تو بہت بڑی شرم کی بات ہے "غیرت اور ہوا نمودی کا سوال
ہے۔"

آپ نے ملاحظہ فرمایا یہاں شعر کا پہلا ہی لفظ "جب" عام معنی میں
استعمال نہیں ہو ایہی یہاں جب سے کوئی خاص وقت مراد نہیں وقت کی پتیلی
مراد ہے۔۔۔۔۔ اسی طرح لفظ کرم عربی کا لفظ ہے اور اپنے جملہ معنوں میں
استعمال ہو رہا ہے۔ کرم کے ایک معنی شرافت کے ہیں ایک معنی فیاضی کے ہیں
ایک معنی عموگی اور خوبی کے ہیں۔۔۔۔۔ ایک معنی قدرت غلبہ اور کارگیری
کے ہیں۔ تعظیم و عزت کے معنی تو سب کو معلوم ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ
لفظ و مرہانی کے ساتھ اس شعر میں ان تمام معانی کی روشنی اس کے مفہوم پر
بڑی تیزی کے ساتھ پڑ رہی ہے۔ تیسرا لفظ رخصت ہے جس کے معنی اجازت
کے تو ہیں ہی اردو میں جو اس لفظ کے ایک معنی نکلی چھٹی دینے کے ہیں ان معنی
نے بھی اس شعر کی تقسیم کو بہت دوہلا کیا ہے۔ اس سے اگلا لفظ بے ہاکی ہے۔
ہاکی کے معنی جو خوف اور ڈر کے ہیں یہ تو سب کو معلوم ہیں لیکن لفظ ہاکی سے
جو بے چینی ہے قراری اور نگہداری کے معنی پیدا ہوتے ہیں انہیں بھی ملحوظ
خاطر رکھا جائے تو شعر کا مفہوم اپنی معنوی عہدہ کشائی کرتا ہوا واضح طور پر
محسوس ہوتا ہے۔۔۔۔۔ بے ہاکی کے بعد گستاخی کے عام معنی جو بے ادبی کے

لے جاتے ہیں اس شعر میں صرف ان سے بات نہیں ہوتی۔ گستاخی کے لفظ میں جو چالاک اور بیکدستی کے معنی جھٹل کر رہے ہیں وہ شعر زیر بحث کے مفہوم میں ایک عجیب معنی خیز صورت حال پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے مصرع کے دو لفظ رہ جاتے ہیں ایک تقصیر اور دوسرا غفلت۔۔۔۔۔ تقصیر قصر سے ہے جس کے سیدھے سادھے معنی کوتاہی کے ہیں جس کو ہمارے شارحین بلاوجہ گناہ تک لے گئے۔ اور غفلت کے معنی ہیں غرور منگی کے۔۔۔۔۔

اب زیر بحث شعر کے ایک ایک لفظ کے بیان کردہ ان معانی کے پیش نظر دیکھا جائے تو اس کا مفہوم کچھ یوں قرار پاتا ہے کہ جب کرم خداوندی یعنی قدرت کاملہ نے اپنی شرافت عظیم کے سائے میں اپنی لامتناہی فیاضی کے ساتھ نہایت خوبی سے آدمی کو یہ کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ وہ کسی خوف اور پریشانی سے بے نیاز ہو کر اپنی نہایت بے باکی کے ساتھ حتیٰ کہ گستاخ ہوتے ہوئے بھی اپنی ہوشیاری، چالاک اور بیکدستی سے پوری طرح کام لیتے ہوئے بھی جس طرح چاہے اپنی فکر سے کام لے سکتا ہے اور جس طرف کو چاہے وہ اپنے رہوار عمل کی باگیں موڑ سکتا ہے پھر بھی اگر انسان یعنی اس قدر حریت فکر و عمل کے باوجود بھی نہ وہ آزادی کے ساتھ سوچتا ہے اور نہ ہی آزادی کے ساتھ عمل کرتا ہے تو ایسی صورت میں اس کی اس کوتاہی کو اس کے قدم آگے نہ بڑھانے کو ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے لیے یعنی آدمی کے لیے اس سے بڑا کفران نعمت اور غیرت کا کوئی مقام کیا ہو سکتا ہے؟

مطلب یہ ہے کہ قدرت نے اپنی طرف سے آدمی کو فکر و عمل کے ضمن میں ہر طرح کی آزادی بخشی ہوئی ہے اب یہ ایک بالکل الگ مسئلہ ہے کہ وہ اپنی اس حریت فکر و عمل کو کام میں کیوں نہیں لاتا؟ اپنے آپ کو مجبور محض

کیوں سمجھتا ہے۔۔۔۔۔ اگر انسان حقیقت الحقائق کے اس کرم پر صدق دلی سے ذرا توجہ دے تو وہ جبر کی بیشتر زنجیروں کو چشمِ ذوق میں توڑ سکتا ہے۔ جبر کو بھول دیکھا جائے تو وہ انسان کی عدم توجہی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔ غالب کے ذوقِ انبیاء کے ضمن میں یہ شعر ایک بہت بڑی مثال اور دلیل کی حیثیت رکھتا ہے بے باک اور گستاخ ہونے کی جو تقاریر مطلق نے اجازت دی ہے دراصل اس کے یہی معنی ہیں کہ آدمی کے تمام شجاعانہ رویوں کا مصدر اور منبع یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی فکر کو آزادی بخشنے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ آدمی فکر کے معاملہ میں کبھی کسی طرح کی ہچکچاہٹ سے کام نہ لے۔۔۔۔۔ انسان کی زندگی کا الیہ اکثر اسی مرحلے سے شروع ہوتا ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ سوچنے سے خواہ مخواہ ڈرتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ خواہ مخواہ اس لیے کہ آزادی سے سوچتے وقت انسان اپنے خارجی حالات کو زیادہ سامنے رکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے باطن کی طاقتوں کی طرف دیکھنے سے اور ان کا اندازہ لگانے سے عموماً محروم رہتا ہے۔ حریت فکر قطعی طور پر آدمی کی دسترس میں ہے اور جب آدمی حریت فکر سے کام لینے کا آغاز کرتا ہے تو آزادی عمل کی راہیں خود بخود کھلنے لگتی ہیں۔۔۔۔۔ ہم اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ غور و فکر کرنا بھی ہمارے عمل کا ایک حصہ ہے بلکہ سچ پوچھا جائے تو غور و فکر بذاتِ خود ایک ارفع و اعلیٰ عمل ہے۔ چنانچہ حقیقت الحقائق کی طرف سے ہماری حریت فکر و عمل پر کوئی قید عائد نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ اپنی خاص مہمانی کے پیشِ نظر انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں بے باک ہونے حتیٰ کہ گستاخ ہونے تک کی اجازت دی ہے۔ آدمی غور و فکر میں بے باک اور گستاخ ہوتا ہے تو فرسودہ افکار کی جگہ کئی ہوتی ہے۔ نئے نئے خیالات سامنے آتے ہیں۔ اور اس طرح آزلو خیالی اور

روشن ضمیری کا قافلہ رواں ہوتا ہے۔ خورد فکر کے ضمن میں اگر انسان اللہ کی اس عنایت بے بہا پر متوجہ ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کے تمام بھگڑے ہوئے حالات نہ سنور جائیں۔۔۔۔۔ حالات کا بلکہ یوں کہنے کہ پوری انسانی تاریخ کے بننے اور بگڑنے کا راز ہی یہ ہے کہ عموماً "حریت فکر کا شور تو آدمی اکثر مچاتا رہتا ہے لیکن خود حریت فکر سے کام نہیں لیتا۔ کام لیتا تو ایک طرف رہا الٹا قدرت کاملہ کو مورد الزام ٹھہراتا ہے کہ اس نے اسے یعنی انسان کو یکم اختیار نہیں دیا۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ قصت ہے بخاری کی
جو چاہے سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
اس طرح کا شکوہ آدمی عموماً "اسی وقت کرتا ہے جب اس کے پیش نظر صرف خارجی دنیا کے حالات ہوتے ہیں اور اس کے اپنے باطن پر اس کی کوئی توجہ نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ باطن کی طرف توجہ نہ دینے کی ابتدا آدمی خود اپنی ذات سے کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے باطن کو تو کیا دیکھے گا عموماً "وہ خود اپنے باطن میں جھانکنے کی ہمت سے گریز کرتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن وہی بات کہ باطن میں جھانکنے کی جرات بھی آدمی میں اسی وقت آتی ہے جب اس کی توجہ اپنے ذوق الہیات پر ہو۔ یعنی اس ضمن میں اللہ پر یقین ہونا بے حد ضروری ہے اور آپ جانتے ہیں غالب کے یہاں اللہ پر یقین وراصل زندگی کی لامتناہی وسعتوں و گہرائیوں اور بلندیوں پر یقین کے ساتھ ساتھ اس کے بے کراں امکانات پر یقین کے مترادف بھی ہے۔ وراصل غالب کا ذوق الہیات ہمت ٹھہا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی روزمرہ زندگی کے عام اور معمولی واقعات کو بھی بڑی وقعت کی نظر سے دیکھتا ہے بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ

صحیح ہے کہ غالب کی نظر اس کے ذوق امیات کے باعث اس کی زندگی کے عام اور معمولی واقعات کو بھی معنی کا بہت بلند مرتبہ عطا کر دیتی ہے اور پھر انہیں عام آدمی کی زندگی پر پھیلا دیتی ہے۔

ہم انشاء اللہ آئندہ صفحات میں غالب کے اس مضمون سے متعلقہ اشعار پر اسی نقطہ نگاہ سے غور کریں گے اور بتائیں گے کہ غالب کے ذوق امیات نے انسان کی عام زندگی کو نہ صرف معنی کی گوناگوں تجلیات سے بھر دیا ہے بلکہ اسے ایک طرح کے حوصلوں سے لبریز رفعت بھی عطا کی ہے۔ جس کو صحیح معنی میں بڑی سے بڑی جدیدیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو روشن خیالی اور حریت فکر کے تمام سوتے ہمیں سے پھوٹتے ہیں۔ روشن خیالی اور حریت فکر کے لیے حوصلہ اور ہمت بہت ضروری ہے اور حوصلہ اور ہمت کا سرچشمہ بھی حقیقت الواقع سے بڑھ کر کس کی ذات ہو سکتی ہے۔ اگر آدمی اپنے آپ کو اللہ کی یاد سے ہمہ وقت سرشار اور مالا مال رکھے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں یہ حوصلہ اور ہمت پیدا نہ ہو۔ غالب کو قدرت نے اسی ہمت اور حوصلہ سے نوازا تھا جس کی بنا پر اس نے یعنی غالب نے اپنی شاعری کو گوناگوں ہمتوں اور حوصلوں سے جی بھر کر مالا مال کر ڈالا۔ لیکن ان ہمتوں اور حوصلوں کو محسوس کرنے کے لیے بھی ایک ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ اور ہم آئندہ صفحات میں یہی کوشش کریں گے کہ انسان کی یہ ضرورت کس طرح پوری ہوتی ہے۔

کے تک ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ وہ یعنی غالب کہتا ہے۔

نظرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تک عمرنی منصور نہیں

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق ہونے کے باعث کائنات کی ہر شے میں
امکانات کی بے شمار وسعتیں بھری پڑی ہیں۔ اس اعتبار سے انسان کی ذات کو
دیکھا جائے تو چونکہ وہ اشرف المخلوقات ہے اس کی وسعتوں کا تو ہم اندازہ ہی
نہیں لگا سکتے۔۔۔۔۔ ایسی صورت میں پھر ایک انسان یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ
میں خدا ہوں۔۔۔۔۔ لہذا منصور نے انا الحق کہہ کر کسی بڑی حقیقت کا
انکشاف نہیں کیا۔ بلکہ اپنے چھوٹے پن کو ظاہر کیا ہے۔۔۔۔۔ اس لیے ہم
اس کی حدودی اس کی تقلید کسی صورت میں بھی نہیں کر سکتے۔ اگر فانی اللہ ہو
کر انسان انا الحق کہنا شروع کرتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ فانی اللہ نہیں ہوا زیادہ
سے زیادہ فانی نفس ہوا ہے اور یہ اس کی کوتاہ بینی ہے کہ اپنی ذات کی وسعتوں
کو دیکھ کر اس نے بھی یعنی منصور نے یہ سمجھ لیا کہ میں خدا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ جب کائنات
کی ایک معمولی شے میں ان گنت امکانات کے خزانے بھرے پڑے ہیں تو انسان
کی ذات میں کیا کچھ نہیں ہو گا۔ لیکن انسان کے ذات میں خواہ کتنی بھی عظمتیں
مضمحل اور پوشیدہ ہو جائیں وہ پھر بھی محدود ہی کہلائیں گی۔ بلکہ ایسی صورت حال
کو دیکھ کر ہمیں یہ احساس ہونا چاہئے کہ پھر ہم اللہ کی عظمتوں کا اندازہ کیوں کر
لگا سکتے ہیں۔۔۔۔۔ اور جتنا جتنا اللہ کی عظمتوں کا احساس ہم میں زیادہ پیدا ہوتا
ہے اسی حساب سے ہم خود بھی بے شمار ہوتے چلے جاتے ہیں۔۔۔۔۔

اصل میں خدا پر کوئی حکم لگا کر انسان حیات و کائنات اور اپنی ذات پر

میں ایران کیوں آیا۔۔۔۔۔ یہاں جو میرے کام سپرد کیا گیا تھا وہ کوئی ایسا بڑا کام ہرگز نہ تھا۔۔۔۔۔ اردو زبان اور مطالعہ پاکستان کے ضمن میں پاکستان میں رہ کر میں زیادہ بہتر طریقہ سے خدمت انجام دے سکتا ہوں۔۔۔۔۔ سعیدہ خاتون نساءت خاموشی سے ایک طرح مجھے یہ کتاب لکھنے پر اکساتی رہی۔۔۔۔۔ میرا رونا دھونا بھی برداشت کرتی رہی۔۔۔۔۔ اور مجھے مزے مزے کے پاکستانی کھانے بھی کھلاتی رہی۔۔۔۔۔

جس طرح فضل کے ایک مطلع کے بعد دوسرا مطلع حسن مطلع کہلاتا ہے اسی طرح میں نے ایک دیباچہ کے بعد دوسرا دیباچہ لکھ کر اس کا عنوان حسن دیباچہ قرار دیا ہے۔۔۔۔۔ یہ دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ نہیں ہے پہلے دیباچہ کا حسن ہے۔۔۔۔۔ ترتیب مضامین میں کوئی اہتمام نہیں کیا گیا جس طرح لکھتا گیا اسی طرح درج ہیں۔۔۔۔۔

آخر میں ایک بار میں پھر یہ بات واضح کر دیتا چاہتا ہوں کہ میں جو غالب کے اشعار کی یہ تفہیم کر رہا ہوں غالب کی ہدایت کے عین مطابق کر رہا ہوں کیونکہ اس نے واضح طور پر کہا ہے۔

گنجینہ معنی کا ظلم اس کو سمجھے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

لہذا میں نے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا یا اور کچھ نہیں کرنا کہ غالب کے اشعار کے ایک ایک معنی پر غور کرتا ہوں اور میرے سامنے مفاہیم کی ایک نئی دنیا آکھڑی ہوتی ہے جس کو دیکھ کر جدید ذہن رکھنے والے لوگ خوش ہو جاتے ہیں اور رجعت پسند اپنا سر پیٹے لگتے ہیں۔

پیرہن کائنات

غالب کے بارے میں عام طور پر جو یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے جو اپنے اشعار میں تصوف اور اہیات کے حوالے سے مضامین بیان کیے ہیں ان کی صورت رسمی انداز کی سی ہے۔ گویا اس زمانہ میں تصوف سے متعلق مضامین اشعار میں بیان کرنے کا ایک عام رواج تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ غالب ان مضامین کے بیان کرنے میں سنجیدہ نہیں تھا۔۔۔۔۔ اوھر ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ غالب نہ صرف ان مضامین کے بیان کرنے میں سنجیدہ تھا بلکہ یہ مضامین اس کی روزمرہ کی عملی زندگی کا حصہ تھے۔۔۔۔۔ اس نے اپنے ذوق اہیات سے ان مضامین کو اپنی زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں بنا کر ہی نہیں دکھایا بلکہ ان تصویروں کی حرکات و سکنات سے جدید ترین یعنی ماڈرن آدمی کی زندگی کو غور و فکر کے تازہ بہ تازہ رنگ و خوشبو سے بھی ملا مال کیا ہے۔

دور جانے کی ضرورت نہیں ہم اپنی بات کا آغاز غالب کے اردو دہان کے بہت ہی مشہور پہلے شعر سے کرتے ہیں۔

ہے کہ پوری کائنات کو کاندھی لباس پہنا کر فریادی بنا دیا۔ نقش کائنات کی فریاد یہ ہے کہ اس کے خالق اور اس کے بنائے والے نے اس کے ایک ایک خود و غل میں بلا کی شوفی بھردی ہے۔ جس کی وجہ سے ایک تو اس پر کسی جگہ بھی کسی کی کوئی نظر نہیں ٹھہرتی۔۔۔۔۔ دوسرے اس شوفی کی وجہ سے کسی کو اسے چھونے کی بھی ہمت نہیں پڑتی۔ غالب نے جو اس شعر کی خود تشریح کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ”ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو موجب رنج و آزار ہے“ تو اس رنج و آزار کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ہم کائنات کی اشیاء کو نہ تو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی اچھی طرح انہیں چھو سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں نقش کائنات بہت نازک، بہت خوبصورت ہے۔ اتنا نازک، اتنا خوبصورت کہ ہمارے حواس بھی پوری طرح اس کا اوراک نہیں کر سکتے۔ لیکن ہماری نارسائی کے علاوہ دکھ کی دوسری بات یہ ہے کہ یہ نقش کائنات فنا ہونے والا ہے اس کو دوام نہیں مگر پھر وہ رہ کر خیال آتا ہے کہ ایسی نازک ایسی خوبصورت اور ایسی معنی خیز چیز مٹ جانے والی کیسے ہو سکتی ہے۔ ضرور اس کی بظاہر فنا پذیری میں کوئی گہرا راز پوشیدہ ہے۔ چنانچہ جب ہم غالب کے اس ذمہ بحث شعر پر مزید غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کائنات فانی نہیں ہے بلکہ اس کائنات کا بصریہن اس کا لباس کاندھی اور فانی ہے اور وہ بھی اس لیے کہ ہم یہ فریاد کرنے کے قابل ہو سکیں کہ نقش کائنات کی شوفی نے جو اس میں طرح طرح کے معانی بھر دیے ہیں وہ تسلیم لیکن انہیں سنبھالنے کی انہیں سمجھنے کی طاقت بھی تو ہمیں عطا کی جائے گویا اس طرح فنا کا تمام راز معنی کے اوراک کے لیے ہے اور کائنات کا باطن فانی نہیں صرف کائنات کا ظاہر فانی ہے اور وہ بھی فانی کیا ہے فنا ایک طرح کا پردہ ہے جو اوراک

معنی کی خاطر اٹھانے کے لیے ڈالا گیا ہے۔ قرآن پاک میں جو ارشاد ہوا ہے کل نفس ذائقة الموت تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس کائنات کی ہر شے پر سے پردہ اٹھایا جائے گا اور کائنات کی ہر شے کے معنی روشن اور واضح ہوں گے۔ گویا کائنات کی ہر شے اپنے معنی کے اعتبار سے قائم رہنے والی ہے۔۔۔۔۔ جس طرح اس کے ظاہر کو فنا ہے اسی طرح اس کے باطن کو دوام بھی حاصل ہے۔۔۔۔۔ لیکن فنا کا پردہ اٹھے گا تو ظاہر ہے وہ حساس مخلوق کے لیے بقول غالب ”موجب رنج و آزار تو ہو گا۔۔۔۔۔“

دیکھ لیجئے غالب کے ذوق امیات نے ایک لفظ شوخی سے معافی کے کس قدر پردے اٹھائے ہیں۔۔۔۔۔ اور کائنات کا سب سے بڑا راز یعنی راز فنا کس خوبصورتی کے ساتھ فاش کیا ہے۔۔۔۔۔ فنا کیا ہے رفتہ رفتہ حقیقت کا آشکار ہونا اور وہ بھی گویا ایک ارتقاء کے ساتھ۔۔۔۔۔

یہاں ہمیں فنا کے صوفیانہ مضموم کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ تصوف میں فنا کے معنی آلائشوں، آلودگیوں اور کوتاہیوں کے ختم ہو جانے کے ہیں۔ گویا یہ کائنات اور ہم فنا کیا ہوں گے ہم میں جو خالص پیدا ہو گئے ہیں وہ دور ہو جائیں گے۔۔۔۔۔ ہماری ہستی ہی کو ضمیمہ کائنات کی ہستی کو بھی ارتقاء نصیب ہو گا۔ جنت اسی ارتقاء ہی کا تو نام ہے۔۔۔۔۔

حریت فکر اور الہیات

حریت فکر کا تقاضا الہیات ہے اور الہیات کا تقاضا حریت فکر۔۔۔۔۔۔
 اگر یہ بات ہے تو پھر درمیان میں کوئی دیوار آکھڑی ہوتی ہے جو ان دونوں کو
 جدا کر دیتی ہے۔ آدمی یوں مھوس کرتا ہے جیسے حریت فکر میں اگر کوئی چیز
 مزاحم ہو سکتی ہے تو وہ الہیات ہے اور اگر کوئی الہیات کا دشمن ہو سکتا ہے تو وہ
 حریت فکر ہے۔۔۔۔۔۔ حالانکہ اس طرح کی کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔۔ حریت فکر
 اور الہیات کے درمیان ایک مرحلہ ضرور آتا ہے جس کا ذکر غالب نے اپنے
 ایک مشہور شعر میں کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں غالب نے صرف اس مرحلہ کا ذکر
 ہی نہیں کیا ایک سوال سامنے آتا کہ ایک انسانی صورت حال کو بیان کر کے اہل
 دانش کے لئے اس مرحلہ سے نکلنے کا ایک حل بھی پیش کیا ہے وہ شعر یہ ہے۔

جاننا ہوں تو اب طاعت و زہد
 پر طبیعت اور نہیں آتی

حضرت غالب بطور انسان ایک عجیب مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔
 ایک طرف تو وہ جانتے ہیں کہ اطاعت اور زہد اختیار کیا جائے تو تو اب حاصل

ہوتا ہے لیکن دوسری طرف ان کی طبیعت نہ اطاعت کے لئے خود کو آمادہ پاتی ہے اور نہ زہد اختیار کرنے کو اس کا ہی چاہ رہا ہے۔۔۔۔۔ گویا اس وقت علم پر طبیعت یا انسان کی نیچر یا اس کی ساخت حاوی ہے۔ عربی میں طبع کے معنی ڈھالنے کے بھی ہیں اور میلا یا گندہ کرنے کے بھی ہیں یوں کہنا چاہئے کہ اس وقت شعر میں بات طبعیات یا فزکس کی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ اور طبعیات یا فزکس کے اس طرح معنی یہ بنتے ہیں کہ طبعیات یا فزکس نام ہے مادہ کو ایک خاص انداز میں ڈھالنے کا یا ایک خاص انداز میں آمادہ کرنے کا۔۔۔۔۔ شعر زیر بحث کے پہلے مصرع ”جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد“ سے پتا چلتا ہے کہ جو شخص یہ کہہ رہا ہے کہ میں طاعت و زہد کا ثواب جانتا ہوں وہ اپنی طبیعت سے ویسے تو بلند مرتبہ ہے لیکن فی الحال طبیعت اس پر حاوی نظر آتی ہے کہ جو اس کو اطاعت اور زہد اختیار کرنے سے روک رہی ہے۔۔۔۔۔ لیکن جب ہمیں اپنی طبع یا طبیعت کی حقیقت کا علم ہوتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ ایک تو طبیعت کو ڈھال ہی گیا ہے کچھ اس طرح کہ وہ ایک دم اونچا اٹھنے کو یا کسی بلند بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ اس کے لئے صاحب طبع کو اپنی طرف سے خاص کوشش کرنی پڑتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانی طبع کو بتایا ہی اس طرح گیا ہے کہ وہ یعنی انسان کو شغل کرے تو اپنی طبیعت کو اور اپنے آپ کو مسلسل بلند یوں کی طرف لے جاسکتا ہے۔۔۔۔۔ بلند سے بلند درجات حاصل کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ بس اس کے لئے ایک شرط ہے کہ وہ کامل ست اور جمود کا شکار نہ ہو کر رہ جائے۔

”جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد“ اس مصرع میں جو لفظ ثواب آیا ہے

آپ جانتے ہی ہوں گے کہ عربی لغت کے اعتبار سے ثواب ایک ایسا لفظ ہے

جس کے معنی غامت عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ثواب کے ضمن میں آپ کوئی خیالی بات کر ہی نہیں سکتے۔ عمل نہیں تو ثواب نہیں۔۔۔۔۔ اور پھر شاید کوئی یہ سن کر حیران رہ جائے کہ ثواب کا براہ راست کوئی تعلق روحانیت سے بھی نہیں بنتا۔۔۔۔۔ یہ تو بے حد نفوس نکدریٹ اور مقرون قسم کی چیز ہے کہ اتنی نفوس دنیا کی کوئی دوسری چیز میرا پتھر فولاد وغیرہ کیا ہو گا جتنا کہ ثواب ہے۔۔۔۔۔ ثواب اصل میں سوت کا سٹے کو کہتے ہیں ثواب کے عربی میں کپڑے کے معنی بھی اسی سے نکلے ہیں اور سوت اس لئے کاٹا جاتا ہے کہ اس سے کپڑا بنا جائے یا بنایا جائے۔ لہذا اس طرح ثواب بھی عمل کے گوناگوں تجربات سے نکل کر اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کا نام ہے۔۔۔۔۔ ثواب کے بعد شعر زیر بحث میں دو لفظ اور ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور وہ ہیں اطاعت اور زہد یہ دونوں الفاظ بھی عربی ہیں۔ طاعت یا اطاعت کے معنی ہیں خوشی سے کسی حکم کو یا بات کو قبول کرنا اور زہد کے معنی ہیں کسی بڑے مقصد کے لئے ہمت کی چیزوں کو ترک کر دینا۔۔۔۔۔ اول تو حکم خواہ کسی قسم کا ہو اس پر عمل کرتے ہوئے انسان فرار تو چاہتا ہے۔ وہ بھلا "سل انکار" جو ہوا اسی لئے پرہیزگاری اور زہد سے چاہے کتنے بھی بلند مقاصد حاصل ہوتے ہوں اس سے انسان کی طبع گریزاں تو ہو گی اور پھر جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے ثواب تو قطعاً ایک نفوس اور مقرون تجربے کا نام ہے اس لئے اطاعت زہد اور پھر ثواب یہ تینوں چیزیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو انسان ایک بار تو ان سے بھاگے ہی گا اور اسی صورت حال کا انحصار شعر زیر بحث میں کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد یعنی مجھے اطاعت و زہد کے عملی اور تجرباتی پہلو کا تو اچھی طرح علم ہو گیا ہے اب تو صرف ذرا غور کرنے سے یہ احساس کرنے کی

جو اس کو اپنے اطراف میں کھینچے اور نو بہ نو امکانات سے پروے اٹھاتے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔۔۔ گویا ثواب کی طرف لانے کے لئے طبیعت کو اعمال انسانی کی ہمیشہ قائم رہنے والی چل پل سے آشنا کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ ثواب کی روٹی سے کچھ وہی مخلص آشنا ہو سکتا ہے جو بڑے عقل اور عقل کے ساتھ اپنے قدم آگے بڑھاتا جاتا ہے۔ جب انسان ثواب کی اس عمل آرا منزل پر پہنچ جاتا ہے پھر اس کی طبیعت میں کسی قسم کا اقباض باقی نہیں رہتا۔ پھر تو بڑی آزادی کے ساتھ سوچنے کی مشق اس میں اس قدر تیزی کے ساتھ پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کے سامنے سے سوچنے اور سمجھنے کے سارے حجابات خود بخود اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس کے چاروں طرف ایک نئی صبح طلوع ہو رہی ہوتی ہے۔

ایسی صبح جس کے ابدالوں سے کون و مکال ہی نہیں جگرگا اٹھتے 'عالم لاہوت' بھی جھٹھ نور بن جاتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو اطاعت اور زہد و پرہیزگاری ایک ایسی صن آفریں اور جمال افروز مشق ہے جس کے عقب میں آزادی اور جس کے پیچھے لذتوں کے نئے سے نئے جہات ہمارے لیے سامان انبساط علوم لیے نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔ اطاعت اور پرہیزگاری کے تحت آزادی کے ساتھ سوچنے کا مطلب بڑے استحکام اور اہتمام کے ساتھ سوچنا ہے۔ جس میں یقین کچھ اور ہی عالم ہمارے سامنے لے کر آتا ہے۔

کفر و ایمان کی کشمکش

غالب کا یہ شعر کفر و ایمان کے ضمن میں بہت پیش کیا جاتا ہے۔

ایمان مجھے روکے ہے تو بچنے ہے مجھے کفر
کعب مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اور اس شعر کے بارے میں عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ یہ شعر انسان کی کشمکش کفر و ایمان کا ایک بہت عمدہ منظر ہے۔ اس شعر کے عمدہ منظر ہونے میں تو کوئی شک نہیں ہے لیکن یہ شعر انسان کی کشمکش کفر و ایمان کو اتنا ظاہر نہیں کر رہا جتنا کہ انسان کے حوالے سے کفر اور ایمان کی الگ الگ کیفیات کو ظاہر کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس شعر سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ انسان پر ایمان کا اثر کیا پڑتا ہے اور کفر انسان کو کس طرح متاثر کرتا ہے۔۔۔۔۔ یعنی ایمان کی حالت میں انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور کفر کی حالت میں اس پر کیا گزرتی ہے۔ اسی طرح شعر ذریعہ بحث میں کہے کو پیچھے رکھ کر غالب نے کہے کی اہمیت کو کم نہیں کر دیا اور کلیسا کو آگے رکھ کر کلیسیا کی عزت اور حرمت کو بڑھایا نہیں ہے۔ البتہ یہ غالب کے آرٹ کا کمال ہے کہ سرسری نگاہ والیں تو کچھ ایسا ہی

معاملہ نظر آتا ہے۔

شعر زیر بحث پر غور کرتے ہوئے پہلی بات جو ہمیں چٹکاتی ہے یہ ہے کہ ایمان سے تو کفلس کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔۔۔۔۔ ایمان تو انسان کی اس کیفیت قلب کا نام ہے جس میں اسے امن و عافیت ہر طرف سے اپنی آغوش میں لئے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ ایک یقین ایک اطمینان ایک وجاہت ایک وقار اور ایک شرافت یہ ہے وہ اثاثہ جو انسان کو ایمان کے ساتھ فوراً حاصل ہو جاتا ہے۔ البتہ کفر کے ساتھ کفلس کا بہت گہرا تعلق ہے جس کو انسان اپنی ناکہی کے باعث اکثر یہ خیال کر بیٹھتا ہے کہ کفر کے باعث تو زندگی میں چہل پہل پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لئے بہت سے حضرات اپنے آپ کو کافر جاہت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور حتم ہلائے حتم یہ کہ وہ اپنی اس کوشش کو آزاد خیالی اور حسرت فکر پر محمول سمجھتے ہیں۔ اور اس گمان میں رہتے ہیں کہ ان سے بڑا وسیع المشرب شخص شاید ہی اس وقت دنیا میں کوئی ہو۔۔۔۔۔

حسرت فکر اور آزاد خیالی سے کفر کا تعلق کتنا اور کس قدر ہے یہ بات ہم ذرا آگے چل کر کریں گے فی الوقت ہم شعر زیر بحث کی صورت حال پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ پہلا مصرع ”ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر“ واضح کر رہا ہے کہ ایمان کے روکنے کے فعل میں جو ایک اعتماد اور یقین و حکمت کے ساتھ ہمدردی اور فلاح و بہبود چاہنے کی صورت موجود ہے وہ کفر کے کھینچنے کے فعل میں ہرگز ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ کفر کے کھینچنے کا فعل واضح کر رہا ہے کہ اسے نہ اپنے پر اعتماد ہے اور نہ اس پر جسے وہ کھینچ یا تحمیت رہا ہے۔ ایمان کے روکنے میں جو خود اعتمادی ہے کفر کے کھینچنے میں اس کا کہیں دور دور بھی پتا نہیں چل رہا ہے۔ البتہ ناراضی اور بے خبری میں جہل کے باعث جو ایک توانائی

کفر میں آجاتی ہے وہ ضرور ہے۔۔۔۔۔ مگر وہی بات اس توانائی میں غور و فکر کی تفتی آمیز کیفیت قطعی طور پر نہیں پائی جاتی۔۔۔۔۔ جبکہ روکنے کے فعل میں غور و فکر کی اس تفتی آمیز کیفیت کا بھی افسار نمایاں طور پر موجود ہے۔ لہذا ایمان کے روکنے کے فعل میں کوئی کشش کی صورت نہیں۔ ہاں کفر کے کھینچنے کے فعل میں کشش کی صورت بھی ہے اور یہ اندیشہ بھی کہ کہیں شکار ہاتھ سے نہ نکل جائے۔۔۔۔۔ عام طور پر کفر کے اس طرح کھینچنے کو دلکشی سمجھ لیا جاتا ہے جو سراسر غلط فہمی کے علاوہ اور کچھ نہیں یا پھر عموماً آدمی اپنی اس صورت حال پر غور نہیں کرتا۔ اگر غور و فکر سے کام لے تو یہ غلط فہمی جلدی ہی دور ہو سکتی ہے کیونکہ اس غلط فہمی میں کوئی زیادہ الجھاؤ نہیں ہوتا۔ غور و فکر نہ کرنا بھی قرار کی سب سے بڑی صورت ہوتی ہے۔ اور آدمی اس کا عموماً شکار رہتا ہے۔

اب رہا شعر زیر بحث کا دوسرا مصرع۔۔۔۔۔ کعب مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے " اس کا مطلب بھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ایمان کے روکنے اور کفر کے کھینچنے کے فعل پر انسان کو پوری طرح غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صورت حال ایسی نہیں ہے جس پر سے سرسری طور سے گزرا جائے۔ رہا یہ سوال کہ ایمان اور کفر کے ساتھ حریت فکر اور روشن خیالی کا کیا تعلق ہے تو شاید آپ یہ معلوم کر کے حیران رہ جائیں کہ حریت فکر اور روشن خیالی سے کفر کا نہ کوئی رشتہ قائم ہے اور نہ کسی طرح کا کوئی رشتہ قائم ہو سکتا ہے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ کفر کے معنی پھپھانے کے ہیں۔ اور حریت فکر کی بنیاد ہی کسی حقیقت کو واضح اور روشن کرنے پر رکھی ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ حریت فکر کا تو پھپھانے کے فعل سے کوئی تعلق ہی

کے ہونے میں بھی شامل نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس کے صرف آپ ہی نہیں ہیں اور بھی بہت کچھ اس کا ہے۔۔۔۔۔ مگر دوسرے لمحے ہی آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ جو بہت کچھ اس کا ہے وہ آپ کا بھی ہے۔ اس کے علاوہ اگر آپ اس چار لفظوں کے جملے کے ہر لفظ کو الگ الگ کر کے پڑھتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے پہلے آپ کو یہ چار لفظ اس طرح معنی دیتے ہوئے کبھی محسوس نہیں ہوئے۔ ہم۔۔۔۔۔ اس۔۔۔۔۔ کے۔۔۔۔۔ ہیں۔۔۔۔۔ لفظ ہم کہتے ہی آپ کی ذات میں ایک رفعت ایک الہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن آپ اپنے جسم کے ایک ایک روکیں کو پوری طرح تجربے میں بھی لا رہے ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے آپ نے اپنے سراپے کو اس طرح کبھی محسوس نہیں کیا۔ اس کے بعد ”اس“ کا لفظ آپ کی زبان سے نکلا ہے تو آپ فضا میں تحلیل نہیں ہو جاتے لفظ اس کے ساتھ اس طرح سارے عالمین کی فضا میں آپ موجود ہوتے چلے جاتے ہیں جیسے زمان و مکان آپ کے ساتھ چلے جا رہے ہیں۔ یہ حرف اشارہ یعنی لفظ ”اس“ اپنے مجرے دکھا رہا ہوتا ہے کہ آپ کی زبان سے حرف اضافت ”کے“ نکلا ہے تو یکایک ساری کائنات تسخیر ہو کر آپ کے قدموں میں آجاتی ہے۔۔۔۔۔ ”ہم اس کے“ یہ تین لفظ پھر اپنے اپنے الگ معنی دینے لگتے ہیں۔ ”ہم“ کے ساتھ ہمارے پاؤں زمین پر نکتے شروع ہوتے ہیں۔ وجود کی بلندیوں کا لطف اٹھانے کے بعد جو ہم دوبارہ زمین پر اترتے ہیں تو اب ہمارے اس لفظ ہم کی کچھ اور ہی شان ہوتی ہے۔ خاک ہونے کے باوصف ہماری یہ شان۔۔۔۔۔ کس لئے؟ اس لئے کہ ہم اس کے اور وہ ہمارا۔۔۔۔۔ اب یہ رشتہ کچھ زیادہ ہی مضبوط محسوس ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ اور اس استحکام کی معراج اس وقت حاصل ہو رہی ہوتی ہے جب ہم ”اس کے“

اس کے تاروں میں بھی ارتعاش پیدا ہوتا ہے وہ بھنکھاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ گویا اس طرح دل اور قطرہ اور ساز کے تار ایک نگاہ میں ہمیں حرکت میں آتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اور ان میں سے انا ابھر کر آواز بھی ایک ساتھ بلند ہوتی سنائی دے رہی ہے۔

اس دوسرے مصرع میں لفظ ساز ایک اور جہان معنی بھی پیدا کر رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں ساز کے معنی صرف کسی آرگن یا ہارپے ہی کے نہیں ہیں ساز کے معنی سلمان کے بھی ہیں۔ لوازمات کے بھی یعنی Equipments اور Ontfits کے بھی۔۔۔۔۔ گویا اب اس مصرع کا مفہوم یوں نکلتا ہے کہ ہر قطرے کا دل ”میں سمندر ہوں“ کے لوازمات سے لبریز ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ ہر قطرہ عرف ظاہر میں قطرہ نظر آتا ہے اندر سے وہ ایک سمندر ہی ہے۔ یعنی ایک قطرہ کو آپ ذرا غور سے دیکھیں گے تو آپ کو وہ سمندر ہی نظر آئے گا۔۔۔۔۔ چلئے یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ شعر در بحث کے پہلے مصرع سے یہ مفہوم واضح ہو رہا ہے کہ اس کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی بہت بڑی ہے یا اس میں بڑا بننے کے بہت امکانات ہیں۔ مگر اس مصرع اول کا دوسرے مصرع سے کیا تعلق ہوا جو یہ کہہ رہا ہے کہ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا۔۔۔۔۔

ظاہر تو شعر در بحث دو لخت ہی نظر آتا ہے کہ پہلے مصرع میں کچھ بات ہو رہی ہے اور دوسرے میں کچھ اور بات لیکن دوسرے مصرع کے ایک لفظ ”ہم“ نے دونوں مصرعوں میں ایک زبردست تعلق پیدا کر دیا ہے اور وہ اس طرح کہ جب کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی چیز میں بڑے ہونے کے ان گنت امکانات موجود ہیں تو انسان پر یعنی ”ہم“ پر تو اس خالق مطلق اور محبوب حقیقی

کی خاص عنایت ہے کہ اس نے ہمیں اشرف المخلوقات بتایا ہے پھر ہمارے بڑے ہونے اور ارتقا پانے کے امکانات کا تصور بھی کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اور اس خاص عنایت کی نظر کے باعث ہم اس کے ہوئے ہیں ایسی صورت میں کسی سے ہماری کوئی تعریف بھی کیسے ہو سکتی ہے

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اب دوبارہ شعر زیر بحث کے اس دوسرے مصرع کی طرف رجوع فرمائیے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس بے پناہ بلوغ مصرع کو غیبی بار پڑھا جائے ایک نیا جہان معنی ہمارے سامنے ہویدا ہوتا ہے۔ پھر کمال کی بات یہ ہے کہ اس میں ایک لفظ کیا پر تھوڑا سا زور دینے اور تھوڑا سا زور کم کرنے پر یعنی ذرا لمبے کے تبدیل ہونے سے دل و دماغ پر ایک عجیب کیفیت گزرتی ہے۔ کیا پر ذرا زور ڈال کر پڑھئے تو آپ اپنے ہونے پر فخر و مباہات سے کہیں کے کہیں بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ اسی طرح ”کیا“ پر ذرا زور کم ڈالئے تو آپ میں ایک عجیب طرح کی پر وقار ہندگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ عجیب طرح کے بلند مرتبہ انکسار کا احساس۔۔۔۔۔

اس مصرع کے حامل مفاہیم ہونے کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اس میں انسانی نفسیات کے استے انفس و آفاق موجود ہیں کہ ان پر انسان ذرا غور کرتا ہے تو شاد و آبادی ضیں ہو جاتا سرمست و سرشار بھی ہوتا رہتا ہے۔ اس ایک مصرع میں انسان کی ذات، انسان کی انا انسان کی شخصیت اس قدر واضح ہوتی ہے کہ اس یعنی انسان کو اپنے چاروں طرف اپنے ہونے کے ایسے ایسے حسن و جمال سے واسطہ پڑتا ہے کہ اس کی نگاہیں نہ صرف دنگ ہو کر رہ جاتی ہیں ان میں ایک بے پناہ قسم کی بیٹائی بھی پیدا ہوتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں انسان کے وجود کے اور اس کے ہونے کے جس قدر
 اور جتنے سرسبز شلواب پہلو زیر بحث شعر کے اس دوسرے مصرع میں نمایاں
 ہوئے ہیں شاید ہی دنیا کے ادب کے بڑے بڑے شاہکاروں میں اس طرح
 نمایاں ہو سکے ہوں گے۔۔۔۔۔ اس مصرع کے یقین کی فضا میں انسانی انا کی
 کوئی آزادی فکر و عمل ہے جو پوری روشن خیالی کے ساتھ نمونہ نہیں ہو
 رہی ہے۔۔۔۔۔؟

بات پختی تری جوانی تک

ہم نے جو غالب کے ذوق الہیات کو اپنا ایک مسلسل موضوع قرار دیا ہے اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ انسان مل جل کر رہنے والا یعنی سوشل اور سماجی جانور ہے۔ پھر وہ یعنی انسان سوشل ہونے کے ساتھ ساتھ عقل و شرو کا بھی مالک ہے۔ ایسی صورت میں اسے صحیح معنی میں مل جل کر رہنے کی سعادت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اپنے دوسرے اہلئے جنس کو بھی اپنی طرح کا ایک انسان نہ سمجھے اور وہ اپنی طرح کا انسان دوسروں کو اسی وقت سمجھ سکتا ہے جب اسے یہ اچھی طرح یقین ہو کہ اس کا اور اس کے دوسرے اہلئے جنس کا خالق ایک ہی ہے۔۔۔۔۔ توحید کا بھی بنیادی طور پر یہی مقصد ارفع و اعلیٰ ہے گویا اس طرح اللہ کو ایک ماننے میں انسان کی فلاح و بہبود کے سارے اسرار مضمر ہیں۔

ہم صحیح معنی میں مل جل کر کس طرح رہ سکتے ہیں اس ضمن میں غالب نے اپنی ایک غزل میں قطعہ کے طور پر دو شعر کہے ہیں۔ ان دونوں شعروں کا حسب معمول کمال یہ ہے کہ یہ بے حد سادہ ہیں لیکن جس قدر یہ سادہ ہیں اس

سے کہیں زیادہ ان میں غالب کے فن کی پرکاری بھری پڑی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان اشعار میں جہاں غالب نے انسان کے سماجی جانور ہونے کا خیال رکھا ہے وہاں اس کے حیوانِ مطلق یعنی صاحبِ عقل و شعور ہونے کا بھی پوری طرح پاس اور لحاظ کیا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں جب آپ کسی کے صاحبِ عقل و شعور ہونے کا لحاظ رکھتے ہیں تو اس کے آزاد خیال اور روشن ضمیر ہونے کا بھی خیال رکھیں گے۔ یعنی ایک طرف انسان کی فطرت میں مل جل کر رہتا پوری طرح رہا اور بسا ہوا ہے اور دوسری طرف وہ صاحبِ عقل ہونے کے باعث اپنی حریتِ فکر و عمل کو برقرار رکھنے کا محتفی بھی ہے۔

اب غالب کے وہ دو شعر سنئے:

نہ سنو مگر برا کئے کوئی
نہ کہو مگر برا کرے کوئی
روک لو مگر غلط چلے کوئی
بخش دو مگر خطا کرے کوئی

ممكن ہے کہ آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ غالب ان دونوں شعروں میں اپنے مخاطب کو نہ کوئی حکم دے رہا ہے نہ کوئی ہدایت یا نصیحت کر رہا ہے بلکہ ان اشعار کے لیے پر آپ ذرا توجہ دیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان اشعار میں تو غالب نہایت محبت سے نہایت شفقت اور ہمدردی سے یہ درخواست کر رہا ہے کہ دیکھو میرے دوست تمہیں اپنی سماعت پر اس قدر کنٹرول ہونا چاہئے کہ جب کوئی تمہیں برا کہہ رہا ہو تو اس کی بات کو سنی ان سنی کر دو۔ وہ کہیں؟ اس لئے کہ جب کوئی انسان دوسرے انسان کو برا کہہ رہا ہو تا ہے تو وہ دراصل اپنے آپ میں نہیں ہوتا۔ اسے کسی نہ کسی انداز کی کوئی

تکلیف پہنچی ہوتی ہے اور ضروری نہیں کہ وہ تکلیف تم نے پہنچائی ہو یا تم سے پہنچی ہو۔

لہذا جب کوئی آدمی کسی کو برا کہتا ہے تو وہ زیادہ طور پر اپنی جگہ صحیح نہیں ہوتا اس لئے اسے اپنے برا کہنے پر سوچنے کے لئے وقت دینا چاہئے۔ اور یہ کام فوری طور پر وہی شخص کر سکتا ہے جس کو برا کہا جا رہا ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اگر ہم اپنی سماعت پر کنٹرول کر لیتے ہیں تو معاشرہ نہ صرف ایک بڑے فتنہ و فساد سے محفوظ رہ سکتا ہے بلکہ انسان کی آزادی فکر و عمل کی راہیں بھی ہموار ہوتی ہیں۔

"نہ سنو گر برا کہے کوئی" کے محبت بھرے مشورے میں صرف سننے والے کی سماعت پر کنٹرول ہی کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ یہ بھی ترغیب دی جا رہی ہے کہ اگر کسی کو بہ امر مجبوری برا ہی کہنا پڑ جائے تو اس کی پیٹھ پیچھے یعنی اس کی عدم موجودگی میں برا نہ کہا جائے بلکہ اس کے منہ پر برا کہا جائے تاکہ سننے والا من کر برداشت کے تجربے سے بھی گزر سکے اور برا کہنے والے کی حسرت بھی نکل جائے اور یوں برائی کا اسی جگہ ایک طرح خاتمہ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ ایک کی بھڑاس نکل گئی دو سرا اپنی برائی سننے کے تجربہ برداشت سے آشنا ہو کر اپنی جگہ مضبوط ہو گیا۔ معاشرہ کی تہذیب و تعمیر اسی طرح تو ہوتی ہے اور خیریت فکر و عمل کے مواقع ظہور میں آتے ہیں۔۔۔۔۔ گویائی اور سماعت کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے شاید اس سے بھدہ حل ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔۔۔۔۔ ہو بھی کیسے سکتا کہ ابھی تک انسان نے ایک دوسرے کی بات کو سننے میں کب کوئی کمال حاصل کیا ہے۔

یہ تو حقی غالب کے دو ذریعہ بحث شعروں میں سے پہلے شعر کے پہلے

آتے ہیں۔ اور جب آدمی اس قدر قوی اور طاقتور بن جاتا ہے تو دوسرے شعر
میں غالب نے پھر دو گزدارشات کی ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر انسان اپنے معاشرہ
کو انسانیت کی معراج تک لے جاسکتا ہے۔ دوسرا شعر ہے۔
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

اوامر و نواہی انسانی معاشرے کے حوالے سے الیمات کا ایک بہت ہی
بڑا مسئلہ ہے بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو انسانی معاشرہ کا سب سے بڑا مسئلہ ایک ہی
ہے اور وہ یہی اوامر و نواہی کا مسئلہ ہے کہ کس بات کی اجازت ہونی چاہئے اور
کس بات کی ممانعت مگر اوامر و نواہی کو بتانا یا واضح کرنا آسان ہے اصل مسئلہ تو
ان پر عمل پیرا ہونے یا عمل پیرا کرانے کا ہے۔۔۔۔۔ اس کے لئے غالب نے
یہ حل پیش کیا ہے کہ پہلے آدمی اپنی سماعت پر قابو پائے یعنی کیا بات سنی ہے اور
کیا بات نہیں سنی اور پھر وہ اپنی زبان پر قابو پائے کہ کس بات کو کہنا ہے اور
کس پر خاموش رہنا ہے۔ اگر انسان یوں اپنی سماعت اور زبان پر قابو پالیتا ہے تو
اس قدر مضبوط ہو جاتا ہے کہ پھر وہ غلط چلنے والے کو غلط چلنے سے آسانی کے
ساتھ روک سکتا ہے اور اس طرح اس میں اتنی ہمت اور حوصلہ بھی پیدا ہو جاتا
ہے کہ وہ خطا کرنے والے کی خطا کو معاف کر دے۔ جس معاشرے میں غلط چلنے
والے کو لوگ غلط چلنے سے روک سکتے ہیں اور خطا کرنے والے کو معاف کرنے
کی ان میں ہمت ہوتی ہے اس معاشرہ کو ہم ایک آئینہ میل انسانی معاشرہ بہت
آسانی اور بڑے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔

کیوں؟ اس لئے کہ ایسے معاشرے میں حریت فکر و عمل کی راہیں اس
قدر روشن ہو جاتی ہیں کہ روشن خیالی اور روشن ضمیری ہر طرف اپنی سچائیوں
کے چراغوں کے لئے میں مصروف نظر آتی ہیں اور اس طرح ہماری یہ بات انسانی
معاشرے کی جہانی تک پہنچ جاتی ہے۔

گناہ و ثواب کی نزاکتیں

ایمان میں گناہ اور معصیت کا مسئلہ سب سے زیادہ نازک مسئلہ ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے بنیادی طور پر آدمی کو آزاد خیال اور روشن ضمیر ہونا ضروری ہے۔ اور اس مسئلہ کی نزاکت اسی مقام پر آکر تلوار کی دھار سے زیادہ باریک اور تیز ہو جاتی ہے کہ معصیت کے مسئلہ کو ایسے افراد معاشرہ حل کرنے بیٹھتے ہیں جو بڑی حد تک نگل اور نگل نظر ہوتے ہیں۔ وسعت نظر اور کشادہ قلبی سے دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ جس نے دل سے اللہ کو مان لیا اس سے کبھی گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا اور اللہ کو دل سے مان لینے کے لیے آدمی کو حد درجہ عقلمند ہونے کی ضرورت ہے۔ حد درجہ سے ہماری مراد صاحب وجدان ہونے سے ہے۔ اس لیے بڑے اہل غرور اور نابغہ روزگار افراد کو اللہ پر ایمان لانے میں کوئی وقت محسوس نہیں ہوتی۔ اللہ پر ایمان لانا ہی عقل و غرور کا سب سے بڑا امتحان ہوتا ہے اور اس امتحان سے ہر صاحب عقل کسی چون و چرا کے بغیر سرخرو نکلتا ہے۔

لہذا ایک طرف آپ کا اللہ پر ایمان ہے اور دوسری طرف آپ سے

کوئی گناہ سرزد ہو رہا ہے یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ To err is human غلطی انسان سے ہوتی رہتی ہے۔ گویا لوگ عموماً ”غلطی اور گناہ کے فرق کو گڈھ کر جاتے ہیں۔ گناہ اور معصیت کے معنی ٹافربانی کرنے کے ہیں اور جب کوئی اللہ کو مان لیتا ہے تو پھر اس سے ٹافربانی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غالب کا نظریہ معصیت یہی ہے کہ جب مجھے اللہ پر پورا پورا یقین ہے تو پھر کوئی مجھے گناہ میں ملوث کیسے قرار دے سکتا ہے۔ چھوٹی موٹی غلطیاں انسان سے ہوتی رہتی ہیں تنگ دل لوگ انہیں گناہ کہہ دیتے ہیں ہمیں سے ایک انسانی معاشرہ میں فتہ و فساد کا آغاز ہوتا ہے۔ سب سے بڑا اور واحد گناہ اللہ کو نہ ماننا ہے اگر کوئی اللہ کو مانتا ہے تو پھر یوں سمجھ لیجئے اس سے گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ غلطی کا امکان البتہ ہر لمحہ ہو سکتا ہے اسی لیے غالب کہتا ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی طے داو

یا رب آ کر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

آپ نے ملاحظہ فرمایا زیر بحث شعر کے دوسرے مصرع سے صاف پتا چل رہا ہے کہ غالب کو یہ یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ کردہ گناہوں یعنی عام غلطیوں کی کوئی سزا بھی ہو سکتی ہے۔ لوگ جن غلطیوں کو گناہ کہتے ہیں دراصل وہ گناہ نہیں ہوتے آدمی کی بے چین اور بے کل طبیعت کے گوناگوں تجربات ہوتے ہیں جو کسی جستجو کے جذبے کے تحت عمل میں آتے ہیں یا لائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی واقعی بندہ خدا ہے تو اس سے اللہ کے ضمن میں کبھی کوئی ٹافربانی کیا ہو سکتی ہے۔ یہاں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ جب کوئی اللہ کی ٹافربانی نہیں کر رہا ہے تو اس سے گناہاں کبیرہ یعنی بڑے گناہ جس میں سب سے بڑا گناہ اور ناقابل معافی گناہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بنانا

ہے یا کسی کو قتل کرنا وغیرہ وغیرہ ہے۔ تو یہ گناہ اللہ کو ماننے والا شخص بھی کرے گا ہی نہیں۔ چنانچہ گناہان کبیرہ کے بعد چھوٹے چھوٹے گناہ اصل میں گناہ نہیں یا تو انسان کی بھول چوک والی غلطیاں ہوتی ہیں یا پھر سچائی کو پانے کے لیے نئے نئے تجربات جن کے بارے میں غالب کہہ رہا ہے۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یا رب

مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اصل میں اس طرح کی غلطیوں کے پس منظر میں وقت کے نئے نئے آفاق معلوم کر کے زندگی گزارنے کی خواہشات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور یہ بات کسی طرح بھی اللہ کی نافرمانی یعنی گناہ اور معصیت کے دائرہ میں نہیں آتی۔۔۔۔۔ کوئی جتنے بڑے ذہن کا آدمی ہو گا وہ اسی زیادتی اور کثرت کے ساتھ نو بہ نو گناہ یعنی تجربات کرنا چاہے گا۔

اس طرح دیکھا جائے تو گناہ کا تمام تر فلسفہ امکانات کی جستجو اور تلاش بلکہ ان کو حقائق میں تبدیل کر دینے کی خواہش کا نام ہے۔ اگر غالب نے بھی کسی کا برا کرنا تو بڑی بات ہے کسی کا برا چاہا بھی نہیں تو وہ اپنے تجرباتی اعمال کو گناہ کس طرح شمار کر سکتا ہے۔

اس طرح کی غلطیاں اور تجربات تو زندگی کے چھپے ہوئے رازوں کو آشکار کرتے ہیں۔ ان سے کوئی زندہ دل انسان اور وہ بھی غالب ایسا حلاشی انسان کس طرح باز آ سکتا ہے غالب کے نزدیک اللہ میاں کا تو ایک ہی سب سے بڑا فرمان ہے اور وہ یہ ہے کہ اٹکے سامنے بلا چون و چرا سر تسلیم خم کر لو اور یہ فرمان عین فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ اسی لیے لا اکفرہ فی الدین کا اعلان ہوا ہے کہ دین میں کوئی کراہت یا مجبوری نہیں ہے یا کوئی ایسی بات نہیں ہے

جس کے لیے تمہارا دل نہ چاہ رہا ہو۔ اگر یہ بات ہے تو پھر ہم وہ باتیں کیوں نہ کریں جن کے لیے ہمارا دل چاہتا ہے۔ اس طرح تو نام فساد گناہ کرنے عین ثواب کی حدود میں آتے ہیں۔ مگر وہی بات کہ اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ آپ بہ حیثیت انسان سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن وہ سب کچھ اللہ کے ایمان کے سائے میں رہ کر ہونا چاہئے۔ ایمان کے عمل عاقبت کی ضرورت انسان کو ہر وقت رہتی ہے۔ اللہ پر واقعی ایمان ہو تو انسان کے عمل کی وسعتیں ساری دنیا ہی کو ضمیمہ آئندہ کے امکانات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹنے کی صداقت رکھتی ہیں۔

غالب دراصل اللہ کی نافرمانی کا تصور ہی نہیں کر سکتا یہ کون سا ایمان کون سی وفاداری ہوگی کہ ایک طرف تو آپ اللہ کو مان رہے ہیں دوسری طرف اس کی نافرمانی کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس کی نافرمانی بعید از قیاس ہے۔ اللہ پر ایمان لانے کے عمل کو اس قدر بلندی پر لے جانا قطعی طور پر کوئی مبالغہ نہیں ہے بلکہ عین فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ اگر ہم تنگ دل تنگ نظر لوگوں کی طرح انسان کے ہر عمل کو گناہ کہنے لگیں تو صحیح معنی میں انسان کے وجدان کی ترقی رک سکتی ہے اور ابھی تک جو انسان پوری طرح اللہ پر ایمان نہیں لاسکا اس کی وجدان انسان کی یہی تنگ دلی اور تنگ نظری ہے جو اس کے وجدان کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہے۔ بغور دیکھا جائے تو گناہ اور ثواب کا مسئلہ غالب کے ذوق الہیات کا سب سے بڑا جرات آزمائے مسئلہ ہے جس کی عقدہ کشائی وہ یعنی غالب آزاد خیالی اور روشن ضمیری کے نرم و نازک اور شفیق ہاتھوں کے ساتھ کرنا چاہتا ہے۔ آزاد خیال اور روشن ضمیر انسان نرم و نازک ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط بھی تو ہوتا ہے۔ اس مضبوطی کی ایک

مثال غالب ہی کے ایک شعر سے پیش کی جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

غالب عدالت کے رویہ کو کھڑے ہیں اور انہیں ایک طرح سزا کا حکم سنایا جا چکا ہے اور سزا بھی عتوبت یعنی مشقت کے ساتھ۔ اب غالب کے کردار کی مضبوطی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ عدالت پر اپنی پوزیشن واضح کر رہے ہیں کہ انہیں کوئی سزا مشقت کے ساتھ کیے دی جا سکتی ہے کہ انہیں زیادہ سے زیادہ گناہ گار سمجھا جا سکتا ہے لیکن وہ کافر تو نہیں ہیں یعنی اللہ کو تو مانتے ہیں اور جب اللہ کو مانتے ہیں تو اول تو اس اقرار کے بعد کسی طرح کا کوئی عمل گناہ قرار ہی نہیں دیا جا سکتا۔ چلئے عدالت سے بھی نا گہبی ہو سکتی ہے اور غالب کے ضمن میں تو واقعی ہو رہی ہے کہ اتنے بڑے مومن کو کہ جو اللہ کو بغیر کسی حیل و جھٹ کے دل سے تسلیم کر رہا ہے اسے آپ سزا دے رہے ہیں اور وہ بھی مشقت کے ساتھ۔۔۔۔۔۔ چنانچہ عدالت کو اپنے حکم پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ اس شعر میں اللہ سے خطاب نہیں کیا گیا عام انسانی عدالت سے یا انسان کی حس انصاف سے کہ اسے کافر اور مومن کے فرق کو تو کم از کم اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے لیکن اس شعر میں غالب کے لیے کو سمجھنا لازم ہے کہ اس لیے میں جو استحکام اور مضبوطی ہے وہ اس کے یعنی غالب کے ذوق ایسات کی پختگی کو واضح کر رہی ہے۔

غالب کی ایک غزل

(جو شروع سے لے کر آخر تک غالب کے ذوق امیات کی آئینہ دار ہے)

اس غزل کا پہلا شعر یعنی مطلع نعتیہ انداز کا ہے اور بہت مشہور ہے۔
 منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
 قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی
 اگر تجلی کو یعنی کھل اظہار کو کوئی شکل قابل قبول تھی تو یہ تیری شکل
 کی صورت میں منظور تھی اسی لیے تیرے قد اور رخ کی وجہ سے یا صدقے میں
 ظہور کی قسمت کھلی ہے۔ نور یعنی روشنی اپنے آپ کو ظاہر تو کرنا چاہتی تھی
 کیونکہ نور یا روشنی کا کام ظاہر ہونا ہی نہیں ہے ظاہر کرنا بھی ہے۔ ایک طرح
 خالق نے پوری کائنات کو بنا ڈالا یا اس کو ظاہر کر ڈالا لیکن جس طرح وہ ظاہر
 کرنا چاہتا تھا ابھی تک اظہار نہیں ہو رہا تھا لیکن جیسے ہی آنحضرت ﷺ کی ذات
 اقدس کا ظہور ہوا تو گویا خود ظاہر کرنے والے کو یہ احساس ہوا کہ جس طرح
 کھل طور پر میں ظاہر کرنا چاہتا تھا اب اس کا اظہار ہوا ہے۔

لیکن یہاں کمال اعتبار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ کی ذات بطور انسان کامل ظاہر ہوئی ہے تو اب اعتبار ہی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ ظہور کی قسمت کے کھلنے کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی پیدائش سے پہلے اعلیٰ درجات انسانی پر فائز ہونے والے جتنے انسان پیدا ہوئے اور ان کے ظہور کی خدمات کے لیے جتنی مخلوق پیدا ہوئی ان کے اعتبار میں کمی کا احساس شدت کے ساتھ تھا کہ جس طرح مخلوقات عالم کو ظہور میں آنا چاہئے اس طرح نہیں آ رہی تھیں لیکن آنحضرت ﷺ کی ذات کے ظہور کے ساتھ یہ احساس جاتا رہا۔ بخور دیکھا جائے تو یہی آنحضرت ﷺ کے ختمی مرتبت ہونے کی بھی دلیل ہے۔ گویا آنحضرت ﷺ کیا پیدا ہوئے ظہور عالم کی قسمت کمال گئی۔ اور اپنے صحیح معنی میں اب ظہور یا اعتبار کا آغاز ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دنیا والوں کو اب کل ہوم ہو فی شان کے معنی سمجھ میں آنے شروع ہوں گے۔ ابھی تک تو نور کا اعتبار ہو رہا تھا لیکن خود نور کو یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے ظاہر ہونے کا بیان کیا ہے۔ شعر زیر بحث کے دوسرے مصرع میں جو دو لفظ آئے ہیں قد اور رخ ان سے اس بیان کا ایک اعتبار سے پتا چل گیا ہے۔ حضور ﷺ کے قد سے نور کے اعتبار کے قد کا اندازہ ہوتا ہے اور حضورؐ کے رخ سے اس نور کے غدوخل کی وضاحت ہو رہی ہے لیکن جس طرح حضورؐ کے قد کو عام آنکھ احاطہ نہیں کر سکتی۔ اسی طرح حضورؐ کے غدوخل پر نگاہ ڈالنا بھی عام آنکھ کے بس کا روگ نہیں۔ لیکن عام آنکھ کی یہ کوتاہی حضورؐ کے قد کی آفاقیت اور ہمہ گیری کا اسی طرح پتا دے رہی ہے جس طرح عام آنکھ کی کوتاہی سے حضورؐ کے رخ کے غدوخل کے حسن و جمال کی پیکرانی کا اندازہ ہو رہا ہے۔ جس طرح حضورؐ کا قد مسلسل انسانی بلندیوں کی طرف جانے کا واضح اشارہ کرتا ہے اسی طرح حضور

کے رخ سے انسانی خوبصورتی کے مسلسل ابواب کھلنے کی نشاندہی ہو رہی ہے۔
 ظہور کی قسمت کھلنے کا ایک واضح اشارہ یہ بھی ہے کہ طبیعیات یا مادہ
 اپنے امکانات کو اب صحیح معنی میں روشن کرنے کے قائل ہوا ہے۔ اس کے
 امکانات اب تک عالم تذبذب میں تھے اب ان کے سامنے آنے کے عہد کا
 افتتاح ہو رہا ہے۔ حضورؐ کی آمد نے جسمانی اور روحانی ہر نوع کے ارتقاء کی
 راہیں کھول دی ہیں۔ اب دنیا کی کسی شے کو دور امکانات کھلنے کا انتظار نہیں کرنا
 پڑے گا۔ اب تو انسان کی اپنی سعی پر انحصار ہے۔ وہ جس طرح کی چاہے ترقی کر
 سکتا ہے۔ البتہ ایک ہی شرط ہے کہ وہ اپنے ذوق الہیات کو باقاعدہ تربیت دے
 یعنی اللہ کی یاد کو باقاعدہ اپنے ذہن میں رکھے حضورؐ کی آمد سے طبیعیات اور مابعد
 الہیات الگ الگ نہیں رہے۔ ان کا دصال بین و اتحیت میں داخل ہو گیا
 ہے۔

اک خونچکاں کفن میں کڑوروں ہٹاؤ ہیں
 پڑتی ہے آنکھ تھیرے شہیدوں پہ حور کی
 اس شعر میں غالب نے خصوصیت کے ساتھ اہل و انفس کو نصایت حسن
 و خوبی بیان سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اگر انسان کا الہیات سے واقعی
 رابطہ قائم ہو جائے تو پھر وہ کس طرح عام زندگی اور موت سے ایک طرح بلند
 ہو کر جلال و جلال الہی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں انسان اللہ
 کے ہونے کی گواہی دیتا ہوا جب عام دنیا کی نظموں میں مارا جاتا ہے تو اس کے
 خون نکلتے ہوئے کفن میں ایسے ایسے بے شمار ہٹاؤ نگھار پیدا ہو جاتے ہیں کہ
 جن کو دیکھنے کی تاب دنیا والوں کی نگاہوں میں تو کیسے آسکتی ہے البتہ عالم بالا کا
 جمال خرد افروز یعنی حوریں جب ان شہیدوں کو دیکھتی ہیں تو ایک عجیب صورت

حال پیدا ہوتی ہے۔

اس شعر کے بارے میں طباطبائی کا کہنا ہے کہ ایسا شعر کبھی کبھی ہی معرض شہود میں آتا ہے۔ بس یہ کہہ کر آگے وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس شعر کے بے پناہ عمدہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غالب نے حسب معمول ایک ایک لفظ کے معنی پر نگاہ رکھی ہے۔ غونچکوں کفن کی عام سی ترکیب خاص معنی دے رہی ہے کہ شہیدوں کے کفن سے ٹپکتا ہوا لہو گویا ایک ایسی فعال صورت پیش کر رہا ہے جس میں ایک ایک قطرہ سے اللہ کے ہونے کی صبح فروزاں اور صبح فراواں طلوع ہو رہی ہے۔ ایک ایک قطرہ سے بہار حسن کے نہ جانے کتنے منظر آنکھوں کو بصیرتیں اور بساتیں بخش رہے ہیں۔ شہیدوں کے کفن سے ٹپکتا ہوا لہو کیا ہے سلام و درود کی بارش ہو رہی ہے۔ اس کفن سے لہو زمین پر کیا گر رہا ہے۔ زمین کی مٹی کے مستقبل کو عرش آسا بنا رہا ہے۔ غرض معانی کے جو آفاق حسن آفرین غالب کے اس ایک مصرع سے نمایاں ہیں۔ ہم ان کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتے۔ اک غونچکوں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں۔ یعنی ہزار شہیدوں کا خون بہہ رہا ہے۔ حقیقت میں جمال زندگانی کی شیرازہ بندی ہو رہی ہے۔ کروڑوں بناؤ کے دو لفظوں نے اس پر اس طرح کندریں بھینکی ہوئی ہیں کہ وہ ہاتھوں میں آ کر ٹٹے جاتے ہیں۔ شہیدوں کے خون کے حسن و جمال کو کوئی کس طرح اپنی گرفت میں لے سکتا ہے کہ یہاں ایک معنی کی رخشگی سنبھالے جسیں سنبھلتی۔ کہ دوسرے معنی کی شعاعوں سے آنکھیں خیرہ ہونے لگتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو نون حقیقت عظمیٰ کی راہ شہادت میں بہہ رہا ہو ہم اس کی جمال افروزی کو کس طرح اپنے قبضے میں لے سکتے ہیں۔ پھر اس کے بعد دوسرے مصرع کی بلاغت کو دیکھ کر آدمی پر بے شمار

کیف اور صداقتوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ ”پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پر حور کی“ اس مصرع کے الفاظ کی جمع واحد نے معانی کو عجیب حسن پرور انداز میں اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ ”پڑتی ہے آنکھ“ یہاں آنکھ ایک ہے لیکن لفظ حور عربی کی جمع ہے مگر اردو میں یہ واحد استعمال ہوتا ہے۔ پھر شہید ایک نہیں بہت سے شہید ہیں اس مصرع کی تشریاتی جائے تو غالب کی ہنروری کا کمال واضح ہوتا ہے۔ اس کی سیدھی سادھی منتر تو کچھ یوں بنتی ہے کہ تیرے شہیدوں پر حور کی آنکھ پڑتی ہے۔ ظاہر ہے شہیدوں پر ایک حور کی آنکھ کیوں پڑے گی۔ لفظ حور کی جمع واضح کر رہی ہے کہ شہیدوں پر ایک نہیں بہت سی حوروں کی آنکھیں پڑ رہی ہیں لیکن یہاں پڑتی ہے آنکھ کا ٹکڑا صاف بتا رہا ہے کہ حوریں شہیدوں کو دیکھنا تو چاہتی ہیں اچھی طرح سے لیکن شرم و حیا دامن گیر ہونے کے باعث حوریں کن انکھوں سے شہیدوں کو دیکھ رہی ہیں۔ اس مصرع میں کن انکھوں کا مضموم ظاہر کرنے کے لیے جس طرح پڑتی ہے آنکھ نے بلاغت کا حق ادا کیا ہے۔ واقعی اس کی دوا نہیں دی جاسکتی۔۔۔۔۔ پھر مزید لطف کی بات یہ ہے کہ حوروں کو آپ کتابھی پاک و پاکیزہ اور مقدس قرار دیں ان کو Sex کی کشش سے محروم نہیں کر سکتے۔ بلکہ شاید پاکیزگی اور لطافت کے ساتھ Sex میں زیادہ شدت پیدا ہو جاتی ہوگی۔ کیونکہ اس تخلیقی عمل کے سرچشمے کو آپ سرور و کیف کی گوناگوں کیفیات سے کسی طرح بھی ویران اور پلٹ نہیں کر سکتے۔ پھر غالب نے اس شعر میں بلکہ خصوصیت کے ساتھ اس کے دسرے مصرع میں نفسیات (عقل و خرد) جنسیات Sex اور انیمیات کو جس طرح یکجا کیا ہے اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ لطف اندوز تو خیر آپ خود بخود ہوں گے۔ اب یہ سب کچھ غالب نے کیسے کر دکھایا اس کو زیادہ تفصیل سے گوش

گزار فرمائیے۔ جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا گیا ہے حور ایسی مخلوق ہے جس کی خوبصورتی کا راز اس کی سفید اور سیاہ آنکھوں میں ہے اور آنکھوں کو ویسے بھی عقل و خرد کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ الحور کمرانی = کے باعث کہتے ہیں۔ مجید الحور یعنی عقلمند۔۔۔۔۔ گویا حوروں میں Sex کا سرچشمہ آنکھ ہو گی جو عقل و خرد کا بھی سرچشمہ ہے اور جنسیت یعنی Sex کی لطافتوں کا بھی مصدر۔ باقی رہی امیہات تو جہاں سفیدوں کا ذکر ہو رہا ہے حوروں کی بات چل رہی ہے وہاں سے آپ امیہات کو کیسے جدا کر سکتے ہیں۔

اب اسی نزل کا تیسرا شعر لہجئے۔

واعظ نہ نود یچ نہ کسی کو پلا سکو

کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

غالب کا بظاہر یہ سیدھا سا شعر ہے اور ممکن ہے کوئی یہ بھی کہے دے اس کا مضمون بہت عام سا ہے لیکن اس کے باوجود شعر ذریعہ بحث میں غالب کے ذوق امیہات کی پوری طرح کارفرمائی نظر آ رہی ہے مگر اس کارفرمائی کو دیکھنے کے لیے محسوس کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حسب معمول اس شعر کے ایک ایک لفظ پر توجہ دی جائے۔ مثلاً "پلا لفظ واعظ ہے۔ واعظ کہتے ہی اس شخص کو ہیں جو ہمیں مذہب اور دین کی باتیں بتاتا ہے۔ گویا واعظ کا براہ راست امیہات سے تعلق ہے۔ لیکن واعظین کے بارے میں یہ بات عام مشورہ ہے کہ یہ لوگ دین و مذہب کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے یہ کوئی بہت ہی مشکل چیز ہے۔ اس کے علاوہ واعظ کے معنی ایسی تقریر ہے جو بہت ہی طاعن انداز میں پیش کی گئی ہو۔ یہاں بھی واعظ اپنے واعظ کو نرم و طاعن کرنے کے بجائے ایسا سخت اور آگتا دینے والا بنا دیتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ اس کو

توجہ سے نہیں سن پاتے۔ مزید یہ کہ اشیاء یا دین و مذہب کا تعلق خیالی باتوں سے نہیں ہوتا۔ دین و مذہب تو آپ کو بہت ہی لمبوس باتیں بتاتے ہیں جن پر آپ آسانی سے عمل کر سکتے ہیں۔ لیکن واعظین پھر وہی بات کہ دین و مذہب پر اس طرح گفتگو کرتے ہیں جیسے دین و مذہب کا تعلق اس دنیا سے نہیں بس آخرت سے ہے اور آخرت کے بارے میں ایک بہت مشہور مصرع ہے کہ عاقبت کی خبر خدا جانے۔

اس زیر بحث شعر میں صورت حال یہ ہے کہ کسی شرابی کو ایک واعظ صاحب مل جاتے ہیں اور وہ یہ بات بتا رہے ہیں کہ میاں تم یہاں کی شراب کیا پیتے ہو آخرت کی شراب پینا جو تمہیں نظر بھی بہت دے گی اور اس سے تمہیں سرور بھی بہت حاصل ہو گا مگر لطف کی بات یہ ہے کہ اس شراب کو پی کر تم ہلکے کے نہیں بلکہ تمہیں اس شراب کا نشہ زیادہ ہو شمند بنا دے گا۔ شراب طہور کے معنی میں بھی شاد مین نے خاصی گزیر کی ہے۔ شراب طہور کا مطلب پاکیزہ شراب نہیں ہے بلکہ جیسا کہ طہور کے معنی ہیں پاکیزہ کرنے والا تو گویا اس شراب کو پی کر آدمی پاکیزہ ہو جاتا ہے اس سے نجات دور ہو جاتی ہے اور نجات یا جس کے معنی بھی ہے وقوفی حماقت کے ہیں گویا شراب طہور عقل کو توازن میں لے آتی ہے جب کہ سرور و کیف اس کا دنیا کی عام شرابوں سے زیادہ اونچے درجے کا ہوتا ہے۔

لیکن چونکہ نہ تو واعظ صاحب و محکمہ ٹھیک دیتے ہیں اور نہ ہی انہیں یہ احساس ہوتا ہے جس شراب طہور کا وہ ذکر کر رہا ہے وہ کوئی خیالی چیز نہیں حقیقت سے اس شراب کا براہ راست تعلق ہے اور بہت مضبوط قسم کا تعلق ہے۔ لہذا اس شراب کا ذکر اس طرح ہونا چاہئے جس سے سننے والوں کو یقین ہو

جائے کہ واعظ جو کچھ بیان کر رہا ہے اس میں صد فی صد صداقت اور سچائی موجود ہے۔ دین و مذہب کے ساتھ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ جس قدر دین و مذہب کی سچائیاں غموس اور حقائق پر مبنی ہیں اتنی ہی انہیں خیالی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے صرف اس لیے کہ آدمی بیش غموس چیزوں ہی سے گریز اور فرار اختیار کرتا ہے۔ گویا ایک تو آدمی کی فطرت میں گریز نے اپنی جگہ بنالی ہے پھر جو افراد دین و مذہب کو پیش کرتے ہیں کیونکہ آخر وہ بھی آدمی ہیں یا انسان ہوتے ہیں لہذا وہ کس طرح نہ فرار اختیار کریں اس لیے غالب شعر زیر بحث میں واعظ پر طنز کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ جناب آپ شراب طہور کے بارے میں باتیں تو بہت بنا رہے ہیں لیکن آپ کے بیان سے یہی پتا چل رہا ہے جیسے یہ شراب نقد نہیں ہے اس کا تعلق ادھار سے ہے۔ جب کہ دین کے احکامات پر چلا جائے تو سادہ پانی کا ایک گلاس بھی شراب طہور ہے یعنی پاکیزگی اور طہارت کے لیے روزمرہ کا عام پانی بہت کافی رہتا ہے۔ اگر عام پانی کو استعمال کرنے والے کی نیت پاک پاکیزہ ہے اس طرح دیکھا جائے تو شراب طہور کا بنیادی عنصر یہ پانی ہی ہے۔ جس تک عام آدمی کی رسائی ہر طور ممکن ہے۔ اس غزل کا چوتھا شعر معنوی اعتبار سے پھر غالب کے ذوق الہیات کے ایک خاص رخ کا پتا دے رہا ہے۔ اور وہ رخ ہے الہیات میں جنس Sex کی کار فرمائی شعر اس طرح ہے۔

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا

گویا سنی نہیں ابھی آواز صور کی

اور کچھ نہیں تو حشر اور صور یہ دو الفاظ تو نمایاں طور پر الہیات سے

تعلق رکھتے ہیں۔ اس شعر کی صورت حال یہ ہے کہ صور اسرائیل پھونکا جا چکا

ہے لوگ زندہ ہو کر اکٹھے ہونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن عاشق کا قاتل یعنی محبوب اپنے عاشق سے خشکی کے انداز میں کہہ رہا ہے کہ تو کیوں کھڑا ہو گیا تجھے تو میری آواز پر کھڑا ہونا چاہئے تھا۔ اور میں نے کوئی آواز نہیں دی۔ اس پر عاشق دوسرے مصرع میں اس تمام صورت حال کی وضاحت کر رہا ہے کہ ان حضرات یعنی عاشق کے محبوب صاحب نے صور اسرائیل کو نہیں سنا حالانکہ یہ خود بھی اس کو سن کر اٹھے ہیں لیکن حشر میں بھی معشوق اپنی معشوقیت کی انا کے زور پر کیسی سمجھ رہا ہے کہ میرے عاشق کو جسے میں نے اپنی آوازوں سے قتل کیا تھا میری آواز پر اٹھنا چاہئے تھا۔ میری آواز کے مقابلے میں کوئی دوسری آواز کیا معنی رکھتی ہے۔

قاتل آپ جانتے ہیں قتل کرنے والے ہی کو نہیں کہتے قتل کے مادہ سے ایک فعل نقتل بھی بنتا ہے جس کے معنی ٹپک ٹپک کر چلنے کے ہیں۔ اپنے جسم کے خاص حصوں کو حرکت دے کر حرکت میں آنے کے ہیں اور معشوقوں کی یہ آواختوں کے قتل کا باعث بنتی ہے۔ اس شعر میں خصوصیت کے ساتھ غالب کہنا یہ چاہتا ہے کہ جنس یعنی Sex کے باعث آدمی کی انا میں اتکا اور ایسا زور پیدا ہوتا ہے کہ صور اسرائیل کی آواز پر بھی معشوق اپنی آواز کو ترجیح دیتا ہے۔ اور اس زور کا احساس محض حشر کے عالم کو خیال اور ذہن میں لانے ہی سے نہیں ہوتا عام روزمرہ زندگی میں معشوق لوگ اپنی انا کے مقابلے میں دوسری کسی انا کو خاطر میں نہیں لاتے یہاں فرائڈ کی ہمنوائی کرنا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ یہاں اس گزارش کا مطلب صرف اتنا سا ہے کہ انسان کی انا کی تربیت اور ساخت میں Sex کا حصہ کس قدر ہے اور وہی معشوقیت کی بات تو کون انسان بیک وقت عاشق اور معشوق نہیں ہوتا گویا ہر انسان معشوقانہ انداز

میں اپنی انا سے دوسرے شخص کو قتل کرنے کی ہوس میں مبتلا رہتا ہے۔

یا پھر غالب اپنے ذوق الہیات کے پیش نظر ہمیں یہ بتاتا چاہتا ہے کہ Individual ego اور Social ego کی طرح انسان کی ایک Sexual ego بھی ہوتی ہے۔ جس پر محض سرسری توجہ دے کر اسے ایک طرف نہیں کر دینا چاہئے۔ پھر اس ایگو کو محض لمبوعب تک محدود کرنے کی ضرورت نہیں۔ یقیناً ایک عجیب طرح کی یکسانی کا حامل انبساط اس کا لازمی حاصل ہے لیکن اس ایگو کے زور کو سنبھالنے کی ہر صورت میں ضرورت ہے۔ اس ایگو کے زور پر ہم قرب الہی تو شاید حاصل نہ کر سکتے ہوں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس ایگو کا زور قربت الہی کی طرف ہمارا رخ ضرور موڑ سکتا ہے۔ ہاں یہاں ہم اس شعر کے حوالے سے اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ قاتل یا معشوق کا حشر میں لڑنا جنسی ایگو کے غیر تربیت یافتہ ہونے کا پتا صد فی صد دے رہا ہے۔ دہی یہ بات کہ معشوقوں کو تربیت دینا کون سا آسان کام ہے اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ معشوق میں ذرا سا شعور ہو تو وہ عام آدمی سے زیادہ تربیت حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ناز و ادا تو تمام تربیت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ غالب معشوق کو حشر میں لا کر اس سے عاشق پر ڈانٹ کیوں ڈالوا رہے ہیں۔ اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ انسان کی معشوقیت کو ایک بلند درجہ سے سرفراز کرنا چاہتے ہیں اگرچہ اس کی ابتدا معشوق کی ڈانٹ سے شروع کر کے وہ یقینی غالب ہم پر یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ابھی دنیا والوں نے انسان کی معشوقیت کو دیکھا کہاں ہے۔ عاشقی کے حوالے سے بہت باتیں ہوئی ہیں لیکن الہیات میں معشوق کا بھی تو کوئی معمولی مقام نہیں ہے۔

زیر بحث غزل کا پانچواں شعر یوں ہے۔

آمد ہمار کی ہے جو بلبل ہے نقد سنج
 ازقی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
 موسموں کے بدلنے میں انسان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے اور دنیا کے یہ
 موسم کیا بدلنے ہیں یوں سمجھئے حسینہ فطرت اپنے ہاتھوں میں ایک گوناگوں الم
 لے ہوئے ہے جسے وہ اپنے خوبصورت ہاتھوں کی محرومی انگلیوں سے ورق افش
 چلی جاری ہے اور بے حد نزاکت اور حسن محتاط کے ساتھ یہ عمل جاری ہے۔
 ہم اپنے اشرف المخلوقات ہونے پر فخر و بہت کرتے ہیں لیکن جانوروں اور
 پرندوں کے خواص بہت سی باتوں میں ہم سے تیز ہوتے ہیں۔ گویا کرہ ارض کو
 بنانے سنوارنے میں انسان سے بڑھ کر دوسرے جاندار زیادہ مصروف عمل
 ہیں۔

بہر حال شعر ذمہ بحث میں غالب نے اپنے ذوق البیات کا ایک بہت سی
 ارفع و اعلیٰ جمال افروز ثبوت دیا ہے اور بتایا ہے کہ کس یکسانی اور زیبائی کے
 ساتھ موسم بدلتے ہیں۔ اور ان کا یہ بدلنا آندھی اور طوفان کی طرح نہیں ہوتا
 بلکہ اس کے برعکس نہایت نرمی و ملائمت اور نزاکت کے ساتھ لیکن
 بتدریج۔۔۔۔۔ آہستہ آہستہ خصوصیت کے ساتھ غالب نے جو تمام موسموں
 کے سردار موسم یعنی ہمار کی آمد کا جس فطری انداز میں نقشہ کشینچا ہے اس کی
 جس قدر داد دی جائے کم ہے سب سے پہلے تھا بلبل کو نقد سنج کیا ہے۔ کیونکہ
 بلبل سے بڑھ کر گلوں کا عاشق پرندہ کون ہو سکتا ہے چنانچہ سب سے پہلے تو آمد
 ہمار کی اطلاع بلبل کو ہونا چاہئے چنانچہ اسی وجہ سے اس نے اپنی آواز کا جادو
 بگانا شروع کر دیا ہے۔ پھر خیال آتا ہے کہ بھی تھا بلبل کی نقد سنجی کو ہم کس
 طرح مان لیں کہ ہمار کی آمد ہے اس لیے فوراً ”دوسرے مصرع میں گویا آمد

ہمار کی اطلاع کا ایک دفتر کھول دیا۔ مگر اس دفتر کی نزاکت بھی قابلِ دید ہے۔ اس کے بلبل کی ہمنوائی کے لیے سارے پرندے تیار ہو گئے۔ یا بلبل کو دیکھ کر ان کے حواس بھی جاگ اٹھے اور وہ بھی چھمٹنے لگے مگر پھر خیال آتا ہے ایک بلبل کی بھڑکی میں ہم سب جو چل پڑے ہیں تو اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ لہذا ان پرندوں کا چھمٹنا اس قدر مختصر تھا کہ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے پرندوں کی چھمٹا ہٹ کو جو چپ سی لگ گئی ہے ابھی اس خبر کو ہم واثق کے ساتھ پیش فیس کر سکتے۔ چنانچہ شاعر کس احتیاط کے ساتھ کہہ رہا ہے "اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طور کی" غالب کے اس مصرع میں کسی بھی مستقبل اور فردا کے لیے ایسی مضبوط صداقت بھری ہوئی ہے کہ جب بھی ہم کوئی اچھی خبر سنانے میں احتیاط سے کام لیتے ہیں تو یہ مصرع پڑھ دیتے ہیں۔ اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طور کی۔ لیکن اس مصرع پر ذرا کان دھرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک دفعہ تو سارے ہاتھوں کے پرندے نقد سرا ہو گئے ہیں اور ان سب پرندوں کی بولیاں اپنی اپنی جگہ اپنے ہونے کا احساس الگ دلا رہی ہیں۔ اڑتی سی اک خبر کے کھڑے نے جو اس تمام تصویر میں ایک دلربا فعال کیفیت پیدا کر دی ہے اس محاکات کا بھی کوئی جواب نہیں۔۔۔۔۔ گویا پرندے کیا اذ رہے ہیں خود ان کے ساتھ ہمار کی ایک خبر اڑی جا رہی ہے اور پھر اسے نہ جانے کیا سوچتی ہے کہ یہ خبر اڑ کر تھا بلبل کے ساتھ بیٹھ کر نقد سنی میں مصروف ہو گئی ہے۔ خبر کو پر کیا لگے ہیں خود خبر میں ایک طرح کی سوجھ بوجھ آگئی ہے۔ اور آخر میں ہمار اس اڑتی سی اس خبر کے پروں پر آتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ اس یلین مصرع سے یہ بھی پتا چل رہا ہے کہ ہمار کی رت کس طرح اپنے حال کے ساتھ اپنے مستقبل کو لے کر چل پڑتی ہے۔ اڑتی سی اک خبر ہی سے یوں بھی محسوس ہوتا

ہے جیسے تمام رتوں کی شاعریوں کی خبر کے لیے گوش بر آواز ہیں۔ اس شعری تنقید کو کیا کرتے مولانا طحاطاہانی نے اس شعری تنقید کو بدیع اور انوکھی تو کہا۔

غزل زیر بحث کا چنا شعر اس طرح ہے
گو واں نہیں پ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کہے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
اگرچہ مولانا غلام رسول مرمرحوم نے تو لکھ دیا ہے ”مرزا غالب نے کہے سے بتوں کی نسبت کے متعلق جو استدلال کیا ہے ظاہر ہے کہ وہ منطقی نہیں شاعرانہ ہے اسے منطقی کی ترازو میں نہ تولنا چاہئے۔“ لیکن میری گزارش یہ ہے کہ غالب کا شاعرانہ استدلال اکثر و بیشتر منطقی ہوتا ہے۔ اس طرح زیر بحث شعر میں بھی غالب نے نری ”شاعری“ نہیں کی انسان کے نظریۃ الہیات پر مجموعی طور سے ایک کڑا ہما کہ کیا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اس ہما کہ میں ان کا لہجہ سخت یا نرم ہونے کے بجائے فکر انگیز اعتدال لیے ہوئے ہے۔

غالب اس شعر میں وسیع فاعل کے ساتھ ایک خدا پرست سے کہ رہا ہے کہ حضرت آپ جو بتوں کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھا رہے ہیں کبھی بھی بت کہنے کے اندر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بتوں کو دیکھ کر یا بت پرستی کے پیش نظر ہمیں متعصب ناراض یا فضا ہونے کی ضرورت نہیں یا اس پر عقادت کی نظر ڈال کر ایک طرف ہو جانا ٹھیک نہیں بلکہ اس کے برعکس ہمیں ٹھنڈے دل سے حسرت فکر کے ساتھ انسان کی تاریخ پر متشہد پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ پہلے کس طرح انسان کا خدا سے براہ راست تعلق تھا اور کس طرح انسان خدا کو اپنے تجربہ میں قریب قریب روزمرہ لاتا رہتا تھا لیکن پھر

مختلف تہذیبوں نے کس طرح انسان کو اللہ سے دور کر دیا جس کی وجہ سے اللہ کی تمام بے کرائی ایک طرف ہو کر رہ گئی اور انسان نے اسے یعنی اللہ کو بتوں کی صورت میں محدود کر کے رکھ دیا۔ بت پرست یہ کہنے میں ایک حد تک درست ہیں کہ وہ بت بنا کر کم از کم اللہ کو دیکھ اور چھو تو سکتے ہیں اور جن کا اللہ نظری نہیں آتا وہ تو محض اللہ کو ایک خیال اور وہم سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دیتے۔ لیکن ان بت پرست حضرات کو یہ کون بتائے کہ اللہ اپنی تمام بے کرائی کے پانچوں اور نظریہ آنے کے باوجود آدمی کو اپنے ہونے کا پورا پورا احساس دلاتا ہے اور جتنا یا جس قدر مقرون تکلیف اور شغوس احساس اللہ کا انسان کو ہوتا ہے ایسا دنیا کی کسی چیز کا نہیں ہوتا۔ مگر وہی بات کہ اللہ انسان کو وسعت نظر اور وسعت قلب کے ساتھ کام لینے کو کہتا ہے مگر انسان ہے کہ اپنے آپ کو چند ایک حواس کے شکنجے سے باہر نکالنے کو تیار نہیں ہوتا اس طرح آزاد خیالی اور روشن ضمیری انسان کا مقدر ہے کیونکہ جب اللہ چاہتا ہے کہ انسان آزاد خیال ہو تو اس سے بڑھ کر اس کے اس مقدر ہر گہر کا ثبوت یا دلیل کیا ہو سکتی ہے۔

گویا غالب شعر زیر بحث میں نہایت مآثران انداز میں یہ کہہ رہے ہیں کہ دین اور مذہب پر نہایت کشادہ قلبی اور وسیع النظری کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ البتہ جدیدیت کا یہ اصرار کہ اللہ پر غور کرنے ہی کی ضرورت نہیں ہے بالکل بے معنی اور لغو ہے۔ اور جدیدیت کی اسی لغویت نے انسان کو ذہنی اعتبار سے پر آئندہ کر رکھا ہے۔ اس وقت سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسان اس پریشان خیالی سے نہالت حاصل کرے۔ کیونکہ انسان کی پریشان خیالی نہ صرف اس کو پریشان کر رہی ہے بلکہ واضح طور پر اسے جہاں کی طرف لے جا

کے ساتھ قدم نہیں جھکتے ہمارے آگے کے بڑھنے کے امکانات کا روشن رہنا مخدوش ہو جاتا ہے۔

لہذا غالب شعر زیر بحث میں انسان کی آگے بڑھنے کی اسی جھجک کو دور کرنے کے لیے اور امکانات کی راہ دکھانے کے لیے کہہ رہے ہیں کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب۔۔۔۔۔ اور دوسرا مصرع تو کمال ہے ساختگی سے کہا ہے آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی۔۔۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ دین میں کوئی قیادت لا اکملہ فی الدین کوئی تکلف نہیں ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جب آپ کو کسی صداقت کی تلاش ہو یا کسی صداقت کے لیے آپ قدم آگے بڑھا رہے ہیں پھر تو بسم اللہ کہہ کر آگے چل پڑنا چاہئے۔ لیکن غالب نے تو اس بے تکلفی کو بھی بہت سہل بہت خوبصورت اور بہت پر کیف یہ کہہ کر بنا دیا ہے کہ آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی۔ یہاں ”بھی“ کے لفظ سے یہ پتا چل رہا ہے کہ موسیٰ ”بھی“ کوہ طور پر سیر کے لیے ہی نکلے تھے۔ معلوم نہیں کس کا شعر ہے ہماری ماں اکثر ہمیں سنایا کرتی تھیں۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھے احوال

کہ آگ لپٹنے کو جائیں چھبری مل جائے

چنانچہ انبیاء نے دین کو اپنے لیے مصیبت سمجھی نہیں بتایا یہ تو ان کی امتوں کے لوگ تھے جو ان کے بتائے ہوئے سیدھے اور صاف راستوں پر چلنے کے بجائے اپنے جاہل اسلاف کے بتائے ہوئے گھٹن راستوں پر ایک تو خود چلنے پر اصرار کرتے تھے اور دوسرے انبیاء کو بھی انہیں راستوں پر چلنے دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن سب سے بڑے دکھ کی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ آج کے جدید ترین ممد کے جدید ترین انسانوں نے بھی اپنے جاہل اسلاف کا یہ چلن نہیں

بدلا۔۔۔۔۔ اور ستم ظریفی یہ کہ اپنے اس چلن کو وہ آزاد خیالی کا نام بھی دیتے ہیں۔ بلکہ اس چلن میں مزید اضافہ یہ ہوا ہے کہ ان جدید لوگوں کا ایک گروہ تو اللہ کا نام ہی لینے کے لیے تیار نہیں۔ ان کا خیال ہے مغرب میں جن اقوام نے ترقی کی ہے ان کی ترقی کا راز ہی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے معاشرہ سے دین کو ایک طرف نکال کر رکھ دیا۔

اب دوبارہ غالب کے شعر کی طرف آئیے۔۔۔۔۔ جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا ہے غالب نے جو نہایت بے تکلفی سے کہہ دیا کہ آؤ ناہم بھی سیر کریں کہ طور کی تو اس بے تکلفانہ انداز گفتار کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ غالب نے بے حد گہری بات کو نہایت ہلکے پھلکے لہجے میں اس لیے کہا ہے کہ آدمی دین کو جس قدر آسانی سے اپنی ذات کا حصہ بنائے گا اسی قدر عاقبت سے رہے گا۔ اور نہ صرف عاقبت سے رہے گا اس میں ایک خاص طرح کی عزت و آبرو بھی فروغ پائے گی۔ اصل میں حریت فکر کا سرچشمہ کشادہ قلبی ہے اور کشادہ قلبی آدمی میں بے تکلفی سے پیدا ہوتی ہے۔ جب تک آدمی اپنے دل کو بڑا نہیں کرتا وہ کوئی بڑی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔ اور اس کے ایسے گھٹ کر سوچنے میں آزادی کا احساس بھی نہیں پائے گا۔ اللہ میاں کو ہوا بنانے میں آدمی کی تنگ دلی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اور تنگ دل آدمی وہی ہوا کرتا ہے جو زندگی کو آسانی سے بسر نہیں کرتا۔ تصنع اور بظاوت آدمی کے دین کو چاہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ بے تکلفی سے آدمی کے دین کا بھی بہت گہرا تعلق ہے۔

اس لیے آپ دیکھیں گے کہ زیر بحث شعر میں غالب کا لہجہ شروع سے آخر تک نہایت بے تکلفانہ ہے۔ کیا فرض ہے کے کھڑے میں ایک لفظ فرض کے دو معنی نمایاں ہیں اور دونوں معنی بے تکلفی سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک تو

اور مضمون کے لحاظ سے ایک بیان ایک معیار کے ساتھ پہنچے۔۔۔۔۔ زبان کا یہ بیان چسکتا ہے تو زبان کے معانی کی مقدار بھی اس میں جھجکتی ہے۔ اب اگر یہ شراب معانی چٹک کر زمین پر گر گئی تو ویسے ہی سامع کے پے کچھ نہیں چڑے گا اور اگر یہ شراب معانی چٹک کر اس کے جگر بہن طبع یا پشاک مزاج پر گر گئی تو پھر اسے لامحالہ غصہ آئے گا۔ اور یوں ابلاغ کے لیے سب کچھ کیا دھرا ہے کار چلا جائے گا۔

لہذا اگر کوئی اپنی بات کو دوسرے تک پہنچانا چاہتا ہے تو غالب کا مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنی بات میں خلوص اور محبت کے جذبات کی طراری تو ضرور رکھے لیکن اس طراری کو سامع تک ایک مقدار میں پہنچنا ضروری ہے۔۔۔۔۔ ابلاغ میں یعنی سننے والے تک بات کو پہنچانے میں ہم اکثر احتیاط سے کام نہیں لیتے جس کی وجہ سے بہت سی باتیں اوجھری رہتی ہیں۔ جس کے باعث فساد خلق کے بے شمار پہلو نکلنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں یا واقعی فساد خلق امکانات سے آگے بڑھ کر واقعیت کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ ایسی صورت میں لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔۔۔۔۔ ویسے تو ہر قسم کی بات کو سامع تک پہنچانے میں احتیاط کرنی لازم ہے۔ اور اس ضمن میں جس قدر زیادہ سے زیادہ خیال کیا جائے گا اسی قدر زیادہ معاشرہ میں امن و امان کی فضا قائم رہے گی۔ لیکن دین کی کسی بات کے ابلاغ کے لیے کچھ زیادہ ہی محتاط ہونا لازم ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ جب کہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ یہ ہے کہ عام طور پر دین پر بات کرتے ہوئے ہی آدمی آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ عام آدمی ہی نہیں اچھے خاصے چڑھے کھسے افراد اس سلسلے زیادتی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے غالب نے بہت ہی سیدھے سادے الفاظ میں اس زیادتی سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔

مگر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہمارے شارحین نے پہلی غلطی تو یہ کی کہ لفظ گری کے معنی پر غور کیے بغیر اس کو تہنی کے معنی دے دیے اگر تہنی کا لفظ ہی انا تھا تو غالب کسی تکلف کے بغیر کہہ سکتے تھے کہ تہنی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر۔۔۔۔۔ مگر چونکہ غالب کو اچھی طرح معلوم تھا۔ تہنی کے بعد سہی کا لفظ استعمال ہو سکتا تھا۔۔۔۔۔ تہنی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر۔۔۔۔۔ گویا بات پر تہنی پیدا کی جاسکتی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر اس میں مقدار مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تہنی تو تھوڑی ہی کافی ہوتی ہے۔ گویا دوسرا مصرع بے معنی ہو جاتا ہے۔ کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی۔ بات کی تہنی پر تو بات سننے والا شکایت کرے گا ہی۔ یہاں لفظ ضرور بھی اب کوئی معنی نہیں دے رہا۔۔۔۔۔ حالانکہ ضرور کا لفظ یہاں غالب کے اعلیٰ شعور بلاغت کی پوری پوری گواہی دے رہا ہے۔۔۔۔۔ یعنی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ کسی کو اونچے نیچے سمجھے میں کوئی بات کہیں اور وہ اس کا ٹولہ نہ لے۔۔۔۔۔

اس غزل کا آخری نواں شعر یعنی مقطع اس طرح ہے۔

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
جج کا ثواب نذر کروں گا حضور کو

پھر وہی بات کہ یہ مقطع تو غالب کے ذوق امیات کا اپنی جگہ پر اپورا ثبوت فراہم کر رہا ہے۔ لیکن ہم اپنے شارحین کو کہاں لے کر جائیں کہ سب سے پہلے تو خواجہ حالی صاحب نے غالب کے ہر خلوص انحصار عقیدت اور معنی آفرین نزاکت نقد اس کا ستیاپاس یہ کہہ کر کر دیا کہ ادھر سفر جج کا وہ اشتقاق اور ادھر ثواب جج کی یہ بے قدری۔ پھر اس کے بعد اس شعر کی تفسیر میں شارحین

قریب قریب مولانا حالی کی ہمکنی پر ہمکنی مارتے رہے۔۔۔۔۔ کوئی اس بات پر
 کھل کر نہ لکھ سکا کہ غالب کو اپنی تمام تر دنیا داری کے باوجود مکہ اور مدینہ
 جانے کا کس قدر شوق تھا اور اس کی عقیدت میں کس قدر خلوص تھا۔ مولانا
 غلام رسول مہر نے الہت مولانا حالی کی خیر ضروری ہے۔۔۔۔۔ شعر ذر بحث میں
 اپنے تمام خلوص اور عقیدت کے باوصف غالب کی شوقی طبع بھی کوئی ڈھکی
 مچھی چیز نہیں ہے۔ لیکن اس شوقی طبع کے پردے میں سے جس طرح غالب کی
 عقیدت جھانک رہی ہے اس کے فرط خلوص کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔
 مزید غور کرنے پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حج کا ثواب نذر کرنے میں کس قدر
 احتیاط سے کام لیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح مولانا حالی نے فرما دیا ہے کہ
 اس پیشکش سے ثواب کی بے قدری کا احساس ہوتا ہے ایسی بات قطعی نہیں
 ہے۔ غالب کی پیشکش تو بہادر شاہ ظفر کو سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ غالب کا
 ثواب حج نذر کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔ بہر حال اس مقطع سے بھی
 واضح طور پر عیاں ہوتا ہے کہ غالب کے الہیات کوئی رسمی چیز نہیں
 تھی۔۔۔۔۔ وہ پوری طرح اور نہایت وسعت قلب و فکر کے ساتھ اللہ کا
 قائل تھا۔۔۔۔۔

اس پر غالب جواب میں کہ رہا ہے یارو اگر میں کہے میں جا کر ٹھہر گیا ہوں تو اس پر مجھے طعنہ دینے کے بجائے حمیس غور کرنا چاہئے کہ اگر میں پہلے کبھی ایک مذہب کی عبادت گاہ میں ہوتا تھا تو کبھی دوسرے مذہب کی عبادت گاہ میں اور کبھی تیسرے مذہب کی عبادت گاہ میرے قیام کی جگہ ہوتی تھی لیکن اب میں کہے میں جا کر ٹھہر گیا ہوں تو اس کی یقیناً ”کوئی وجہ ہوگی اور وہ بہت واضح ہے کہ مجھے اس سے پہلے کسی عبادت گاہ میں بھی وہ اطمینان قلب حاصل نہیں ہوا جو کہے میں آکر ہوا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کہے میں آکر میں اپنی پچھلی زندگی کو فراموش کر گیا ہوں اور مجھے اس کا احساس نہیں رہا ہے کہ ہر عبادت گاہ میں جا کر میں نے کچھ نہ کچھ حاصل کیا ہے ہر عبادت گاہ کا مجھ پر احسان ہے اگر صومعہ میں مجھے ایک حقیقت کا عرفان ہوا تو کلیسا میں دوسری حقیقت نے اپنے رخ سے پردہ اٹھایا۔ میں نے تو بت خانوں میں بتوں سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ ہر عبادت گاہ کے لوگ اپنا ایک شعور ایک احساس رکھتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میری طبیعت کو اس تھوڑے سے شعور اور احساس سے پوری طرح قرار حاصل نہ ہوتا تھا۔

کہے میں وسعت قلب و فکر کے ساتھ ٹھہرنے کے مواقع اور امکانات مجھے بہت نظر آئے اس لیے میں یہاں آکر ٹھہر گیا۔ لیکن میرا یہاں کا ٹھہرنا دوسری عبادت گاہوں کی طرح محدود قسم کا ٹھہرنا نہیں ہے۔ میں کہے میں کیا آ گیا ہوں ایسا کی پوری تاریخ میرے سامنے ہے اور پھر صرف سامنے ہی نہیں یہ تاریخ ایسا آگے کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ مجھے حریت فکر و عمل کے چھتے اور جس قدر امکانات کے وقوع میں آنے کا احساس یہاں ہوا ہے اور کسی جگہ نہیں ہوا۔

لیکن آپ جانتے ہیں کہ غالب اسے سے مملوم ہے آکر کہاں رکنا ہے۔
اس کے اشعار کی ہمیشہ بہت سی حمیں ہوتی ہیں اور غالب کا خشاء ہمیشہ میں ہوتا
ہے کہ وہ اپنے قاری کو معنی کی کسی نئی اور اچھوتی منزل کی طرف لے جائے۔

ویسے شاعرین نے جو یہ شرح کی ہے اس میں سب سے بڑی خرابی یہ
ہے کہ بہشت میں چونکہ انسان کے لیے آرام و آسائش کے اعلیٰ و ارفع
انتظامات ہوں گے اس لیے اسے قہم کر دیا جائے یہ بالکل انسانی فطرت کے
خلاف بات ہے۔ یوں بھی اس میں کیا برائی ہے اگر اللہ کی اطاعت کے بدلے
میں انسان کو بہشت کے یہ بیش و آرام میسر آجائیں یا ان کی خواہش کی جائے۔
غالب کی حقیقت پسندانہ طبیعت اس طرح کی بات ہرگز نہیں سوچ سکتی۔ تو یوں
کہتے کہ غالب بہشت کے خلاف ہرگز نہیں ہاں بہشت کے عام تصور کے خلاف
ضرور ہو سکتا ہے بلکہ بہشت کے تصور ہی کے خلاف کیا غالب تو دوزخ کے عام
تصور کے بھی خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کے ثبوت کے لیے دور جانے کی
ضرورت نہیں اسی زیر بحث شعر کے ذریعہ بات ثابت ہو رہی ہے۔ اور آپ یہ
معلوم کر کے بہت خوش ہوں گے کہ غالب نے کس ہنرمندی کے ساتھ بہشت
ہی کے نہیں دوزخ کے عام تصور کے خلاف بھی علم بغاوت بلند کیا ہے۔۔۔۔۔
مگر وہی بات کہ بے حد چابکدستی کے ساتھ جی ہاں حیران کن چابکدستی کے
ساتھ۔

ہاں تو زیر بحث شعر میں غالب صاحب فرما رہے ہیں کہ لوگوں نے جو
یہ سمجھ لیا ہے کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے تو ہمیں یہ یہ عمدہ اور
مزے کی چیزیں ملیں گی اس میں دودھ ہی کی نہیں شد کی خبریں بھی ہوں گی۔
طرح طرح کے پھل ہوں گے حوروں کی گھٹلوں میں پڑی پڑی آنکھوں والی

خوبصورت عورتیں بھی ہوں گی۔ تو بہشت کا یہ تصور تو بہت ساکن جامد اور ٹھہرا ہوا تصور ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ تصور قرآن پاک کا دیا ہوا تصور ہے لیکن قرآن پاک میں یہ کہاں ارشاد ہوا ہے کہ تم کسی تصور پر ٹھہراؤ اور آگے کو قدم نہ بڑھاؤ بہشت تو مسلسل آگے کو بڑھنے والا مقام ہے۔ اس میں صرف دودھ صرف شہد ہی کی ضرورت کیوں ہوں گی یہ تو لوگوں کی قوت عقیدہ کو سمیٹ دینے کے لیے قرآن نے آغاز کے طور پر کہا تھا اسی طرح دوزخ میں بھی صرف آگ کے شعلے یا طوق و سلاسل وغیرہ ہی کیوں ہوں گے سزا کے لیے ان سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہو سکتی ہیں۔ مگر لوگ آسانی کے ساتھ بہشت اور دوزخ کے عام جامد و ساکن تصور سے کس طرح نجات حاصل کر سکتے ہیں اس کے لیے صرف مجھے (یعنی غالب کو) ایک ہی تدبیر سمجھ میں آئی ہے کہ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو گناہگاروں کی کثرت اور زیادتی کی وجہ سے ہم مانتے ہیں کہ دوزخ کا رقبہ زیادہ ہو گا اس میں بہشت کو آسانی سے ڈالا جاسکتا ہے لیکن رقبہ کے اعتبار سے بہشت ہزار چھوٹی ہو رحمت الہی کی بے کرائی کے باعث یہ اپنی طاقت اور اثر میں دوزخ سے بہت بڑی چیز ہے اس لیے جیسے ہی بہشت کو دوزخ میں ڈالیں گے بہشت ہی نہیں دوزخ کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ یعنی بہشت کی ٹھنڈک سے دوزخ بجھ جائے گی۔ اور پھر اسی طرح لوگوں کے ذہنوں میں ایک ہی بہشت اور ایک ہی دوزخ کا تصور ابھرے گا۔ جس کی وجہ سے ان کی اطاعت خالص اللہ کے لیے ہو گی کیونکہ اس اطاعت میں اللہ کی رحمت اور اللہ کے خوف اور عذاب کا بھی ایک نیا تصور ہو گا جس میں انسان کی رحمت فکر و عمل کے لیے بہر حال امکانات بے حد روشن ہوں گے۔

اور زیر بحث غزال کا تیسرا شعر امیات غالب کا تیسرا رخ دکھاتا ہے اور

اس طرح دکھاتا ہے کہ ہم ناخدا روزگار لوگوں کے ہمارے میں نئے رخ سے سوچتے گئے ہیں۔ اور ہم میں اپنے بہت سے فرسودہ خیالات کو خیرباد کہنے کی بہت پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔۔ جس کی بے حد ضرورت ہے۔

ہوں مخرف نہ کیوں وہ د ر س م ثواب سے

نیز حاکم ہے قلم سر نوشت کو

اس شعر پر پہلی نظر پڑتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے غالب ثواب ہی کے خلاف ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے غالب کے شاعرین نے بس پہلی نظر ڈالنے ہی کے نتیجے میں اس شعر کی تشریح کر ڈالی۔ ہمارے مولانا غلام رسول مہر فرماتے ہیں "میں ان طور طریقوں سے کیوں نہ پھر جاؤں جن پر چل کر ثواب حاصل ہوتا ہے۔ میری حالت تو یہ ہے کہ جس قلم سے میری قسمت لکھی گئی ہے اسے قلم ہی نیز حاکم تھا۔ لہذا جو تحریر لکھی گئی ہے وہ بھی نیز حاکم ہی ہے اور میرے لیے سیدھے راستے پر چلنا اور ثواب حاصل کرنا بے" غیر ممکن ہو گیا ہے۔" مولانا مہر نے یہ تو صحیح لکھا ہے کہ غالب ثواب کے عام راستوں سے مخرف ہے لیکن موصوف نے یہ نتیجہ غلط نکالا ہے کہ غالب کے لیے سیدھے راستے پر چلنا اور ثواب حاصل کرنا بے" غیر ممکن ہو گیا ہے۔

اصل میں غالب ثواب حاصل کرنے کے خلاف نہیں ہے ہاں لوگوں نے ثواب حاصل کرنے کے لیے جو راہیں اختیار کی ہیں غالب ان کو غلط سمجھتا ہے۔ اور اسی لیے ان سے مخرف ہے۔ شعر ذیل بحث سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ غالب جس طرح فارسی خوب جانتا تھا اسی طرح وہ عربی کا بھی عالم قاضی تھا۔ مثلاً اس شعر میں عربی کے چار لفظ آئے ہیں۔ مخرف، ثواب اور قلم و قلم۔۔۔۔۔ ان چاروں لفظوں سے ہمارے شاعر نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے

اور فارسی کے ایک لفظ سرفروشت کے معنی کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ اب ذرا تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔ مخرف کا مادہ حرف ہے جس کے معنی پھیر دینا، جکانا دینا ہے اور مائل ہونا بھی۔۔۔۔۔ لطف کی بات یہ ہے کہ حرف انقلم کے معنی ہی ٹیڑھا قند لگانا ہے۔ یعنی قلم کی نوک کو ٹیڑھا کانٹنا۔ اور عربی کے لفظ ثواب جس سے ثواب بنا ہے اس کا مطلب ہے اپنے مقصد کی طرف لوٹنا۔ یعنی اچھا عمل کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا۔۔۔۔۔ اور فارسی کے لفظ سرفروشت کے معنی آپ جانتے ہی ہوں گے کہ تقدیر ہے۔ یعنی پہلے سے کسی ذات میں اس کے امکانات کا بھر دینا کہ وہ کیا کیا کچھ کر سکتی ہے۔

اب غالب کے ذمہ بحث شعر کے معنی سمجھئے۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ کس طرح یہاں بھی غالب انسان کی حریت و فکر و عمل کو یعنی آزاد خیالی اور روشن ضمیری کو بنیاد بنا کر بات کر رہا ہے۔ غالب کا کہنا یہ ہے کہ میں ثواب یعنی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ان عام راستوں سے انحراف کیوں نہ کروں جن پر چل کر نہ میں آزادی کے ساتھ کچھ سوچ سکتا ہوں اور نہ کوئی قدم اٹھا سکتا ہوں۔ جب کہ اللہ کی خوشنودی تو اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب آدمی غور و فکر سے کام لے کر کوئی قدم اٹھاتا ہے۔ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ پانچ وقت نماز پڑھ لی حج زیارت کر آئے اور کبھی کسی فقیر کو کچھ دے دلا دیا اور یہ لیجئے ثواب حاصل ہو گیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو شعر ذمہ بحث میں غالب اپنی بات نہیں کر رہا ہے پورے انسان کی بات کر رہا ہے کہ اگر کوئی واقعی انسان ہے تو وہ غور و فکر کے بغیر ثواب کس طرح حاصل کر سکتا ہے کیونکہ اس کی تقدیر اس کی فطرت میں اس کی سرفروشت میں قلم کو ٹیڑھا قند دے کر بنی خوبصورتی سے لکھ دیا گیا ہے کہ وہ بھی آنکھیں بند کر کے کوئی قدم نہ اٹھائے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ قلم کی نوک کو اگر ٹیڑھا قلم نہیں لگایا جائے گا تو وہ نہ اچھی طرح چل سکے گا اور نہ ہی پھر اس سے خوبصورتی کے ساتھ کچھ لکھا جاسکے گا۔ جن لوگوں نے سرکٹے کا قلم تراش کر اور اس کی نوک کو کاٹ کر یہ تجربہ کیا ہے وہ میری بات کی تائید کریں گے۔ مطلب یہ کہ عرف عام میں ٹیڑھی یعنی ہٹی ہٹی راہوں پر چلنا انسان کی فطرت میں ہے۔ غالباً یہ سن کر میرے ذہن کا رنیں حیران کم اور خوش زیادہ ہوں گے کہ سیدھے سائے اور ضس راستوں پر چلنا اللہ والوں کا کام نہیں ہے۔ یہ تو شیطان اور اس کے چیلوں کا کام ہے۔ اور شیطان نے جو روز اول اللہ کی حکم بدولی کی قسمی اس میں بھی اس کا یہی اصرار تھا جی ہاں ضس سیدھی سادھی سائے قسم کی منطق کہ اللہ تو نے مجھے آگ سے بنایا ہے جو اوپر کو اٹھتی ہے اور انسان کو مٹی سے جو نیچے رہتی ہے۔ اس لیے میں انسان سے اعلیٰ ہوں اس کو سجدہ کس طرح کروں۔ دوسری طرف فرشتے انسان کے قتل و غارت اور فساد کی بات کر رہے تھے۔ اس پر سارے فرشتوں کو شیطان سمیت اللہ کا جواب تھا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ یعنی ارتقاء کے لامحدود امکانات کو۔ لہذا اپنی محدود قسم کی منطق کو رہنے دو اور انسان کو سجدہ کرو کہ یہ تمہاری طرح محدود ہو کر رہنے والی مخلوق نہیں ہے۔ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو شیطان اپنی محدود فکر کے باعث انسان کو آذلولی کے ساتھ سوچنے اور کوئی عمدہ قدم اٹھانے سے روکتا ہے جس کی وجہ سے دنیا میں فساد پھیلتا ہے اور تاریخ کا ارتقاء رکا کھڑا ہے دوسری طرف ہمارے بڑے بڑے دانشور شیطان کو اس کا کرینٹ وسیع چلے آئے ہیں۔ اسی طرح شیطان نے جو اللہ کی نافرمانی کی اس کو ان لوگوں نے ایک طرح سراپا ہے کہ شیطان نے بڑا حوصلہ دکھایا تھا حالانکہ اللہ کی نافرمانی زندگی کے لامحدود امکانات سے انکار کے

علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ میری اس گزارش پر نہایت لطف سے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح جنت میں شجر ممنوعہ کی طرف بڑھنے کے لیے انسان کو جو شیطان نے اکسایا تھا وہ بھی لامحدود امکانات کے لیے جس صبر و تحمل کی ضرورت تھی شیطان کا مقصد اس صبر و تحمل پر ضرب کاری لگانا تھا۔ چنانچہ اہل دانش اور اہل فکر و خبر کی خدمت میں میری طرف سے دوبارہ استدعا ہے کہ وہ قصہ آدم و ابلیس پر دوبارہ یعنی نئے سرے سے غور فرمائیں۔۔۔۔۔ اگرچہ ایسا کرنے سے دنیائے ادب کے بڑے بڑے شاپکاروں کی حیثیت و دگرگوں ہو جانے کے خطرات سے دوچار ہو سکتی ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں اگر ہم علامہ اقبال کی ایک مشہور نظم ”جریل و ابلیس“ پر اس طرح غور کرتے ہیں تو اس کی حیثیت کچھ عجیب قسم کی جتنی نظر آتی ہے۔ یعنی اس کے تمام معانی الٹ پلٹ ہو جاتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ابلیس کا بیان اس کے باوجود مضحکہ خیز ہی نظر آتا ہے۔۔۔۔۔ جب کہ اس کے جواب والے مصرعوں میں سے یوں لگتا ہے کہ ان کی ساری ہوا نکل گئی ہے۔ واضح رہے کہ علامہ کی اس نظم کو بطور نظم شاعری کا ایک عمدہ نمونہ قرار دے رہا ہوں میرا مقصد تو اس نقطہ نگاہ سے اس نظم کو دیکھنا ہے جس میں حرکت کا سرچشمہ انسان کی ذات ہے اور شیطان سوائے وجود پیدا کرنے کے اور انسانی ارتقاء کو روکنے کے اور کوئی کام نہیں کرتا۔ اب علامہ کی اس نظم کو دیکھتے ہیں۔

جریل کے اس سوال پر ”کیا نہیں ممکن کہ حیرا چاک دامن ہو رفو؟“

ابلیس جواب دیتا ہے

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سید

اول تو جبریل علم و حکمت کا فرشتہ ہے اسی لیے تو وحی اس کی بدولت آنحضرت ﷺ پر اترتی رہی پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جبریل اس کے اس راز سے واقف نہ ہو۔ اس کے علاوہ ابلیس یہاں بھی حسب معمول جھوٹ بول رہا ہے کہ اس کا سیو لوٹ کر اس کو سرست کر گیا ہے۔ اسی طرح ابلیس کی زبان سے یہ بیت بھی کس قدر لغو معطوم ہو رہی ہے حالانکہ لفظی اعتبار سے اس میں کوئی کمی نہیں۔

جس کی نو میدی سے ہو سوز درون کائنات
اس کے حق میں حقائق اچھا ہے یا لا حقائق
اول تو یہی نری دروغ گوئی ہے کہ ابلیس کی نو میدی سے کائنات کے باطن میں سوز پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے حق میں حقائق کس طرح اچھا ہو گا۔ غرض معنوی اعتبار سے ساری بات بگڑتی چلی جاتی ہے۔

اور جبریل کے کہنے پر

کھو دیا انکار سے تو نے مقامات بلند
چشم بزدوں میں فرشتوں کی رہی کیا آمد
اس کے جواب میں ابلیس جو کہہ رہا ہے وہ پھر ہمارے نقطہ نظر سے سراسر نیکو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں رہتا۔ حالانکہ اپنی جگہ شاعرانہ اعتبار سے تمام مصرع جان دار نہیں۔

ہاں تو ابلیس جواب دیتا ہے۔

ہے مری جرات سے مشت خاک میں ذوق نمو
لاحول ولا قوۃ۔۔۔۔۔ ابلیس کی جرات سے مشت خاک میں ذوق نمو
ہے یا ذوق جہاں و بربادی۔ بینہ دو سرا مصرع بھی نری لغویات سے بھرپور ہے۔

ایلیس کہتا ہے میرے فتنے جابر عقل و خرد کے تار و پھ۔ بھلا ایسی فضول بات کو کوئی کج فہم ہی تسلیم کر سکتا ہے۔ کہ شیطان کے فتنے عقل اور خرد کے تارے بنائے ہیں۔ اس سے اگلے مصرع کو تو جبریل کے لیے ایک مستحکم خیز مست کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ یعنی ایلیس جبریل سے کہہ رہا ہے کہ دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر۔ اللہ اللہ کہاں فرشتہ علم و حکمت اور کہاں اس پر حقیقت سے فرار کا الزام۔ غرض جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ فنی اعتبار سے تو قلم خوب ہے مگر معنوی اعتبار سے ہمارے نقطہ نظر کے حوالے سے بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ بھلا دیکھئے تو سہی ایلیس اپنے بارے میں کہہ رہا ہے میں کلکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح۔ کیا پدی کیا پدی کا شور پ۔ پہلے تو خود اللہ سے قیامت تک کے لیے انسانوں کو بھکانے کی مسلت مانگی اور اب فرما رہے ہیں میں کلکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح۔

مکرر عرض ہے کہ ہو سکتا ہے آدم و ایلیس کی شخصیت پر دوبارہ غور کرنے کے لیے جو میں نے اہل دانش سے درخواست کی ہے وہ کوئی بڑی بات ہو ورنہ میں تو یہی کہوں گا کہ حیرت فکر و عمل کا سرچشمہ انسان ہے شیطان نہیں۔ بقول غالب انکار اور انحراف کی جرات صحیح معنی میں قدرت نے انسان ہی کو دی ہے انسان ہی کی تقدیر اور سرنوشت کو خوبصورت لکھنے کے لیے قلم کے قلم کو ٹیڑھا لگایا گیا ہے۔ قلم لگانے سے یا قلم رکھنے سے قلم خوبصورت کس طرح لکھ سکتا ہے۔ اس کے لیے میں سمجھتا ہوں یہ شعر بے عمل نہ رہے گا۔

جو شمع کا کوئی کھل لے تو اور ہو روشن

جو اس پہ قلم کوئی رکھے تو اور ہو طرار

یہ لہجے غزل زیر بحث کا اب آخری شعر جو مقطع بھی ہے اور چوتھا شعر

بھی ہے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ شعرا ایسات غالب کا ہمیں چوتھا رخ دکھا رہا ہے۔

غالب کچھ اپنی سسی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن چلے اگر نہ طبع کھائے کشت کو

بظاہر اس شعر سے بڑی مایوسی کا اظہار ہو رہا ہے لیکن حقیقت میں ایسات کا جو ایک اہم ترین پہلو ہے جس کو عرف عام میں بندگی کہا جاتا ہے اس پر غالب ایک خاص زاویے سے روشنی ڈالنا چاہتا ہے۔ ایک طرف تو آپ اللہ کے سامنے اپنے آپ کو عاجز بندہ قرار دے رہے ہیں گویا بندگی کا پورا پورا اقرار کر رہے ہیں دوسری طرف آپ سے اگر کوئی ذرا سا بھی کام انتہام کو پہنچ جاتا ہے تو غرور کے مارے آپ کا برا حال ہو جاتا ہے۔ اور چشمِ زدن میں بکھنے لگتے ہیں اللہ تو خواہ مخواہ اپنے آپ کو درمیان میں لاتا ہے ورنہ سب کچھ کرنے دھرنے والا تو انسان ہی ہے۔

اس غرور کو توڑنے کے لیے غالب زیر بحث شعر میں ایک لفظ ”اپنی“ پر زور دے کر کہہ رہا ہے کہ یا دو مجھے خالی اپنی سسی اپنی کوشش سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جب تک کہ اس میں اللہ کے لطف و کرم کی شمولیت نہیں ہوئی۔ میری سسی میری کوشش کا تو یہ ہے کہ اگر میں نے زمین میں مل چلا کر اس میں بیج ڈالا اسے پانی بھی دیا پھر میری کھیتی ہری بھری ہو کر تیار بھی ہو گئی تو اس پر ٹڈی دل نے حملہ کر دیا۔ اور اگر کسی سال ٹڈی دل نہ آیا تو میں نے اپنے زعم میں فصل کو ڈیر لگا کر اس کا خرمن بنا کر تیار کر دیا اور بے فکر ہو گیا۔ لیکن میری کوشش پوری ہوئی ابھی میں نے یہ غرور کیا ہی تھا کہ اس پر بجلی پڑ گئی۔ غرض جب تک اللہ کا لطف و کرم شامل حال نہ ہو کوئی بات نہیں بنتی۔ ہو

سکتا ہے یہاں یہ سوال کر دیا جائے کہ اب تو زمانہ ترقی کر گیا ہے مادی دل کی بھی روک تھام کر لی جاتی ہے اور عرصہ میں پر بجلی نہیں پڑنے دی جاتی تو اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ قدرت کی مدد کے بغیر پھر بھی کام نہیں چلتا۔ اصل میں سنی سے زیادہ قدرت پر بھروسہ کرنے کا صرف اتنا سامطلب ہے کہ انسان کی سنی ہزار سب کچھ ہونے کے باوجود سب کچھ نہیں ہوتی۔ کیونکہ انسان کی سنی سے کسی کام کے کچھ امکانات ہی روشن ہوتے ہیں بہت سے امکانات پھر بھی باقی رہتے ہیں۔ اس لیے قدرت کی طرف دیکھنا انسان کی سنی کو وسعت بخشنے کے حروف ہے۔ انسان کی سنی کو نقصان پہنچانے کی غرض سے نہیں۔ اور اصل بندگی بھی یہی ہے کہ انسان ہر وقت اپنی سرحد عمل کا خیال رکھے اور قدرت سے اس میں وسعت پیدا ہونے کی دعا کرے۔

تو غالب نے شعر زیر بحث میں اپنے بندہ ہونے کا اس طرح ثبوت دیا ہے کہ اپنے عمل پر غور نہیں کیا۔ البتہ یہ کہہ کر کہ مجھے اپنی سنی سے لبتا نہیں۔ یعنی میری اپنی کوشش سے مجھے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ ضرور ثابت کیا ہے کہ قدرت کی طرف سے آدمی کو کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ کا خیال رکھنے سے بندے کے قول و فعل میں ایک خاص طرح کی وسعت پیدا ہوتی ہے جس کے سارے سے وہ کہیں کا کہیں پہنچ سکتا ہے۔ جی ہاں اس مقام تک بھی جس کا اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔ غالب کی ایہات کا یہ رخ بھی کوئی کم اہم نہیں ہے جس نے انسان کی سنی کو ہر طرح سے دیکھنے کی دعوت دی ہے۔

کہہ سکتا ہے جس کا ذوق المیات واقعی سلجھا ہوا اور عصر تازہ کے ساتھ عین مطابقت بھی رکھتا ہو۔"

انہوں نے حیرت اور طر کے لئے جملے جذبات کے ساتھ کہا "آپ کے خیال میں ذوق المیات کے ساتھ جدید ذہن یعنی جدیدیت اور جنس یعنی Sex کا آپس میں بہت گہرا ربط و ضبط ہے؟"

"جی ہاں! جس طرح ذوق المیات کا وقت کے ساتھ ساتھ ارتقاء پذیر ہونا ایک فطری سی بات ہے اسی طرح جدیدیت یعنی نوجوان ذہن کا جنس اور Sex کے بارے میں نئے انداز کے ساتھ برتاؤ کرنا بھی ایک فطری امر ہے۔ سچ پچھنے تو جدیدیت اور Sex ذوق المیات کے عقل عاطفت ہی میں صحیح معنوں میں پروان چڑھ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ تازہ خون میں اگر ذوق المیات کا نور شامل ہو جائے تو جدید ذہن تخلیقی عمل کو اپنے قابو میں رکھتا ہے۔۔۔۔۔ قابو میں رکھنے سے میری مراد تخلیقی عمل کا گلا گھونٹ کر رکھنے سے نہیں ہے اس کو اچھی طرح سنبھالے رکھنے سے ہے۔"

"بھائی منکھور تم تو فلسفے میں گھس کر پور کرنے لگے۔ ہم سے۔۔۔۔۔ سیدھی طرح بات کیوں نہیں کرتے میں تمہارے سامنے غالب کا زیر بحث شعر پھر دہراتا ہوں تاکہ تم اصل موضوع کی طرف آ جاؤ۔۔۔۔۔"

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تھری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
"ہاں تو نیند سے دماغ کا نور راتوں سے ذوق المیات کا ایک ربط و ضبط سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن محبوب کی زلفوں سے اور عاشق کے بازو پر ان کے بکھر جانے سے یا پریشان ہو جانے سے ذوق المیات کا کیا تعلق ہے؟"

میں نے کہا "آپ نے ایک نوجوان یا جوان آدمی کی نیند کو اس کے دماغ کو اور اس کی راتوں کو کسی دو شیزہ کی زلفوں سے الگ کرنے کی نامعقول

ہمت (محاف کیجئے) کیسے کر لی۔"

وہ فوراً "بولے" یعنی آپ یہ سمجھتے ہیں کہ جوانی کی غینہ جوانی کا دماغ اور جوانی کی راتیں یہ سب چیزیں کسی دو شیرہ کی زلفوں کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتیں؟"

"جی ہاں کوئی حیات افروز فعال اور بامراد معنی نہیں رکھتیں۔"

"اس بات کو ذرا تفصیل سے بتائیے۔"

آپ جانتے ہیں آدمی کے عمد شباب کو فکر و عمل کے لیے جہاں جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے وہاں آرام اور غینہ کی بھی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اتنی ہی سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی جوان دس گھنٹے کام کرتا ہے تو دس گھنٹے ہی اس کے لیے سونا اور آرام کرنا بھی ضروری ہے۔ اتنی ہی سے میری مراد یہ ہے کہ یہ مقدار مقرر کرنا دماغ کا کام ہے یا دماغ کی صلاحیتوں اور اعضاء کے قوتی کا کام ہے اور جوانی کے دماغ کو Sex صحت مند حالت میں رکھنے کی بے مثال استعداد رکھتا ہے۔۔۔۔۔ کسی دو شیرہ کی زلفیں اس استعداد سے بالا مال ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ وہ صاحبِ فور سے من رہے تھے تو میں نے بھی اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "غالب نے جو ذریعہ بحث شعر کے دوسرے مصرع میں تصویر کشی کی ہے اس کی جس قدر داد دی جائے کم ہے اسی لیے مولانا طہطاہائی نے اس شعر کو بہت الفضل ہی میں کما غالب کا کارنامہ بتایا ہے اور واقعی اس اعتبار سے یہ شعر ایک کارنامہ ہے کہ اس میں انسانی Sex کو جس قدر ارتقاء Sublimation دی گئی ہے اور بظاہر ایک عام سی بات کے ذریعہ اس کا کوئی جواب نہیں۔۔۔۔۔ تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشان ہو گئیں۔۔۔۔۔ ویسے تو ہمارے شار جین نے زلفوں کے پریشان ہونے کی وجہ خاصی فحش بتائی ہے مثلاً "مولانا غلام رسول فرماتے ہیں "اختلاط کی گریجوٹی کی وجہ سے ایسا ہوا" اور آغا محمد باقر نے تو ماشاء اللہ مزید وضاحت سے فرمایا ہے "

یعنی عبادات میں Sex کی مداخلت کو برضا و رغبت الہی تسلیم کیا گیا ہے۔ "میری بات کو کانتے ہوئے وہ صاحب کہنے لگے "ہے شک مشکور آپ کی یہ قرآن والی بات بہت دل کو لگی ہے۔ واقعی رمضان کا مہینہ تو خاص طور پر عبادات کا مہینہ ہے اور عبادات ہی کا مہینہ نہیں اس میں تو قرآن پاک کا نزول ہوا تھا۔ شب قدر بھی اسی مہینے میں ہوتی ہے۔ اتنی ساری الہیات کے ہوتے ہوئے بھی اگر Sex کی اہمیت اور حرمت کو تسلیم کیا گیا ہے تو واقعی غالب کے ذوق الہیات نے غالب سے یہ شعر کسٹوا کر Sex کی پاکیزگی ہی کو آشکار نہیں کیا انسان کی آزاد خیالی کے بھی راستے کھولے ہیں۔ بغور دیکھا جائے تو انسان کی روشن ضمیری کے بہت سے ابواب Sex کی اہمیت کو تسلیم کرنے سے بھی وا ہوتے ہیں۔ Sex کی طرف سے نگاہیں کا شکار ہو تو آدمی کے سامنے عجیب عجیب قسم کے اندھیرے جلاؤں کی طرح گھونٹنے پھرنے لگتے ہیں۔

غالب کا زیر بحث شعر بڑے ہی لطیف انداز میں Sex کی عظمت کو واضح کر رہا ہے۔ "میں نے کہا "جناب Sex کی عظمت اور خوبی کی اس سے بہتر تصویر کوئی کھینچ کر دکھائے۔" انہوں نے کہا "مشکور تم سچ کہہ رہے ہو۔ نیکی Sex آدمی کے دماغ کو عرش سے بھی آگے لے جاتا ہے۔ انشاء کا یہ شعر تو مشہور ہے ہی کہ "تصور عرش پر ہے اور سر پہ پائے ساتی پر۔۔۔۔۔ فرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں۔" لیکن میر صاحب کا بھی ایک شعر من لو۔۔۔۔۔ میں نے کہا "ضرور سنا ہے۔ ضرور ہامزہ ہو گا۔" بولے "تو سنئے۔۔۔۔۔ ہر ذرہ آفتاب سے کرتا ہے ہمسری۔ اللہ رے دماغ ترے پانچاں کا

میر صاحب تو صرف معشوق کے قدموں سے پانچاں ہونے کا لطف اٹھا رہے ہیں۔۔۔۔۔ غالب کا شعر تو کہیں بلند ہے۔"

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب

غالب کے ذوق الہیات کا یہ اعجاز بھی کوئی کم قاتل غور نہیں ہے کہ
سیدھے سادھے اور عام لفظوں میں ایسے ایسے معانی کے اجالے اٹاتے ہیں کہ
آوی ویکھتا کا ویکھتا رہ جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ ایک بہت عام سے مفہوم اور مضمون
کا شعر ہے۔

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

لوگ ہر سال حج کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ حج میں سب سے بڑی
رکاوٹ استطاعت ہوتی ہے۔ حج یا عمرہ کرنا ضروری تو ہے لیکن اگر استطاعت
نہیں ہے تو کوئی ضروری نہیں۔۔۔۔۔۔ استطاعت سے عام معنی یہی لیے جاتے
ہیں روپیہ بڑھ یعنی اگر کسی شخص کے ذمہ کوئی دوسرے ضروری فرائض نہیں
ہیں اور مقام حج یعنی کعبے تک پہنچنے کے لیے اس کے پاس زاو رہ موجود ہے تو
اس پر حج لازم ہو جاتا ہے۔ غالب کے پاس مکہ پہنچنے کے اسباب مہیا ہو گئے تھے
یا مہیا ہوتے نظر آ رہے تھے چاہے بہادر شاہ ظفر کے حوالے ہی سے
سی۔۔۔۔۔۔ اب کوئی عام آدمی ہوتا تو وہ خوشی خوشی حج پر جانے کی تیاری میں
مصروف ہو جاتا۔ روپے پیسے والی استطاعت کا مسئلہ تو حل ہو رہا تھا یا ہو گیا تھا

اپنی ذات پر تنقید و طنز کے ہر طرف سے وار کر رہا ہو گا۔ اور شرم و حیا کے ہر وار پر غالب جہاں اپنے پورے وجود کو عرق انفعال میں شرابور دیکھ رہا ہو گا وہاں اس کی ذات سنور کر اور نکھر کر سامنے آ رہی ہو گی لیکن جتنی اندر سے ذات نکھر رہی ہو گی اتنا ہی باہر سے ہیبت الشرف دور ہوتا جا رہا ہو گا۔ شرم و حیا کا یہ ایک عجیب مقدر ہے کہ وہ فوراً "آدی کو اندر سے تو صاف و شفاف اور آئینہ بنانے کا آغاز کرنے میں دیر نہیں لگاتی لیکن باہر کے حالات بعض اوقات تو قہقہے کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ غالب کے اندر سے آواز آ رہی ہو گی اب ہزار ہمار شاہ ظفر مجھے اپنے ساتھ لے جانے کو رضامند ہوں لیکن میں جانے کے لیے تیار نہیں۔ کیونکہ شرم و حیا نے جس طرح اس کے باطن کو شفاف بنانے کا آغاز کیا ہو گا اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ وہی بات کہ آدی جب شرم و حیا کے ذریعہ اپنی ذات کو آئینہ بنانے لگتا ہے تو پھر جلدی سے اس عمل کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ پھر مزید یہ کہ جس قدر باطن صاف ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ ظاہر کی نزاکتیں اور لطافتیں آدی پر ہویدا ہونے لگتی ہیں۔ جب غالب نے یہ کتنا شروع کیا ہو گا کہ کبھی کس منہ سے جاؤ گے غالب تو اس کے ساتھ ہی اسے امنٹ پتھر سے تعمیر کیا ہوا کعبہ کچھ اور ہی نظر آ رہا ہو گا۔ کیونکہ جب آدی کی آنکھیں کھلتی ہیں تو پھر قہقہے میں اور قبلہ نما میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ ایسے لمحوں میں اہل نظر کے لیے ان کا مجھو سرحد اور اک سے پرے نہیں رہتا قبلہ نما ہی میں قبلہ نظر آنے لگتا ہے۔

پھر اپنے آپ پر طنز کرنے کا یہ جیسا انداز آدی کو ذوق امبیات کے بغیر کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ طنز کے اس چٹکے انداز میں بقول غالب ایسے کڑوڑوں بناؤ پوشیدہ ہوتے ہیں جو آدی کو ایک انوکھی گواہی اور ایک نرالی شہادت کے لیے تیار کر سکتے ہیں۔ باقی رہی شرم کی بات تو شرم کا آقا انسان کی انا کے بے ہودہ حصار کو توڑتا ہے ایک طرح سے انسان کے لیے حریت فکر کی راہیں کھولتا

ہے۔۔۔۔۔ آزاد خیال انسان سے زیادہ شاید ہی کوئی فرد معاشرہ میں صحیح معنی میں شرمیلا کہلا سکتا ہو۔ آزاد خیال شخص کے بارے میں یہ بھی ایک غلط پروپیگنڈہ ہے کہ اس میں شرم و حیا نہیں ہوتی۔ آزاد خیالی اور روشن ضمیری جب انسان کے سامنے حریت فکر کے نو بہ نور راستے کھولتی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ شرم و حیا جیسے شفاف جذباتوں سے محروم رہ جاتا ہو۔ شرم کے جذبات کاسب سے نمایاں اظہار چونکہ چہرے سے ہوتا ہے اس لیے یہ کہہ کر کہہ کیسے کس منہ سے جاؤ گے غالب شاعر اپنے آپ کو بڑے اعتماد کے ساتھ آئینہ دکھا رہا ہے۔

اس طرح جو ذمہ بحث شعر میں کہے کے ایک لفظ نے الہیات کے حوالے سے ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہے ایسا ہنگامہ جس کا تمام متاثر انسان کی عزت و حرمت بچانے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس کے علاوہ جب یہ ہنگامہ فرو ہو گا اور ایک اطمینان کی کیفیت پیدا ہوگی تو اس کا حسن و جمال بھی دیدہ و بنا کے لیے دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ شرم تم کو گھر نہیں آتی کی فریاد سے صاف پتا چل رہا ہے کہ حریت فکر کا سورج طلوع ہو رہا ہے جس کے اجالوں سے حسن و خوبی کا ایک عجیب عالم ہو پیدا ہونے والا ہے۔

رات پی زمزم پہ سے....

۹

ہماری اس مہنگو کا جو عنوان ہے وہ دراصل غالب کے مندرجہ ذیل شعر کے مصرعہ اول کا ٹکڑا ہے۔ پورا شعر اس طرح ہے۔

رات پی زمزم پہ سے اور مجھ
دھوئے دھوئے جامہ احرام کے

ہم آپ سب جانتے ہیں کہ زمزم ایک چشمہ ہے جو کبے سے چند گز کے فاصلے پر واقع ہے۔ غالب کی جرات دیکھئے لوگ رات کو زمزم کے پانی سے وضو کر کے عبادت الہی میں مصروف ہوتے ہیں اور ان حضرت نے کبے کے قریب عین زمزم کے چشمے کے کنارے بیٹھ کر شراب پی۔۔۔۔۔ بات دراصل یہ ہے کہ طہیحات اور مابعد الطہیحات یا مویت اور روحانیت یا الہیات کو عوام ہی نہیں اکثر خاص افراد بھی دو الگ الگ چیزیں سمجھتے ہیں۔ اور اسی دوئی کی وجہ سے ابتدا سے لے کر آج تک عرفان و آگہی میں ابھی خاصی ہنگامہ آرائی برپا ہے۔ اسی دوئی اسی شہوت یعنی مادہ اور روح کو الگ سمجھنے کے باعث مادہ کو حقیقت اور روح کو محض ایک ذہنی اختراع سمجھا جاتا رہا ہے۔ مادہ کا اور اک چو تکہ حواس کے ذریعہ ہوتا ہے اس لیے عرفان حقیقت کے ضمن میں اس کو زیادہ اہمیت دی جاتی رہی۔ روح کی حقیقت کے بارے میں انسان آج تک ابھی

ہوا ہے۔ اس کے علاوہ سائنس کا تعلق چونکہ تمام تر مادے کے ساتھ ہے اور مادہ اپنی فطرت میں بے شمار امکانات سے بھرا ہوا ہے جس کی وجہ سے آئے دن طرح طرح کے سائنسی انکشافات اور ایجادات ہو رہے ہیں اس لیے مادیت کا بھی بول بالا ہو رہا ہے لیکن جب مادہ سے سب کچھ حاصل کرنے پر بھی انسان کی تسلیم نہیں ہوتی تو پھر وہ ایمات کی طرف آتا ہے یعنی اللہ کے بارے میں سوچنے لگتا ہے ایسی ہستی کے بارے میں جو اس کی ایک تو یہ تسلیم کی خواہش پوری کر سکے دوسرے اس کو جاوداں بھی بنا سکے کیونکہ کائنات کی معنی خیزی دیکھ کر اس کا دل مرنے کو نہیں چاہتا اور اس پوری دنیا میں مرنے کے علاوہ کوئی دوسرا عمل ایسا ناممکن نظر نہیں آتا جیسا کہ یہ مرنے ہے۔

غالب مادہ اور روح کی دوئی کا قائل نہیں تھا یا اس کا ذوق ایمات اس دوئی کو سب سے زیادہ بے نیکی اور بے معنی بات سمجھتا تھا۔ اسی لیے وہ زیر بحث شعر میں ایک آزادانہ منظر پیش کر رہا ہے جو دوئی کا مذاق اڑا رہا ہے لیکن ساتھ ساتھ وحدت روح و مادہ کا بھی اظہار کر رہا ہے۔ بے یقینی شراب اپنی جگہ مادیت کی نمائندگی کر رہی ہے اور زمزم روحانیت کا نمائندہ ہے۔ یوں تو شراب بھی پینے کی چیز ہی کو کہتے ہیں اور زمزم بھی قدرتی پانی کا چشمہ ہے۔ شراب کی تاخیر یہ ہے کہ وہ اپنا اثر دکھانے میں دیر نہیں لگاتی۔ زمزم کے پانی کا اثر دیر میں ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے مادہ کا احساس فوراً ہوتا ہے اور روح کے کرشمات کا آہستہ آہستہ پھیلنا ہے گویا زمزم کے کنارے بیٹھ کر غالب شراب کیا پی رہا ہے مادیت اور روحانیت کی وحدت کو واضح کرنے کی سعی میں مصروف ہے۔ رات کے وقت یہ کام اس لیے ہو رہا ہے کہ اس عمل میں رکاوٹ ڈالنے والے لوگ سو رہے ہوتے ہیں اور پھر مزید لطف کی بات یہ ہے کہ غالب احرام یمن کر شراب پی رہے ہیں جبکہ احرام پھینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات پر کچھ افعال کو حرام کر لیتا ہے مثلاً "کسی جاندار کو نہیں مارنا" وغیرہ تک کو بھی

نہیں۔ زوجین کو ایک دوسرے کے قریب نہیں آنا، خوشبو نہیں لگانا وغیرہ وغیرہ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ احرام پن کر غالب شراب پینے کو ممنوع نہیں سمجھتے۔ اصل میں ایسی بات یا فعل غالب کس طرح حرام سمجھ سکتے تھے جب کہ وہ تو بزم خوش مادیت اور روحانیت کو ایک کرنے میں مصروف تھے۔ توحید کا ڈنکا بجا رہے تھے۔ بھاگ دہل اعلان کر رہے تھے کہ لوگو ہاگن نہ ہو کائنات اور اس کی روح کو الگ نہ سمجھو یہ دونوں ایک ہیں اور اگر تم نے اس بات کو سمجھ لیا یعنی یہ کہ مادہ اور روح ایک چیز ہیں تو چشمِ زدن میں تھماری نہایت ہو جائے گی تم اللہ کے قریب ہو جاؤ گے آدمی مادیت میں رہ کر اللہ سے دور ہوتا ہے روح کو بھی مادیت کی طرح محسوس کرنے لگے تو اس کے ذوقِ الہیات میں ایک انقلاب آ جاتا ہے۔ اگر غالب اس طرح ڈنکا بجا کر بھاگ دہل اعلان کر کے زمزم کے کنارے شراب نہ پی رہے ہوتے تو انہیں مسجد یعنی صبح ہوتے ہی جائے احرام کے دھبے دھونے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ احرام کے دھبے انہیں اس لیے دھونے پڑے کہ وہ تنگ دل اور تنگ نظر لوگوں سے خود کو بچانا چاہتے تھے اس میں غالب کی بزدلی کسی طرح نظر نہیں آتی بلکہ غالب یہ کام زیادہ جرات اور حوصلہ کے ساتھ سرانجام دے رہے تھے کہ رات کے وقت وسیع المشرب افراد سویا نہیں کرتے رہ جھکا مٹایا کرتے ہیں۔ اگر غالب کا یہ فعل کسی طرح بھی ممنوع ہوتا تو سب سے پہلے وہ یعنی غالب ان عالی حوصلہ اور بلند نگاہ لوگوں کے خوف میں اور رعب میں آتے۔

اسی مضمون کے ایک دوسرے شعر میں تو غالب ایک دوسرا ہی عالم دکھا رہے ہیں۔ پہلے شعر میں تو صرف احرام کے دھبے دھونے کی بات تھی اب تو سرمستی کا یہ عالم ہے کہ جائے احرام شراب میں بری طرح آلودہ ہو چکا ہے۔ لہذا غالب اپنے آپ کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ حرم کا طواف بھی کیا جا سکے۔ اب تو جائے احرام کو زمزم کے پانی سے صاف کرنے میں وقت لگے گا۔

دسزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
 آلودہ پہ سے جامہ احرام بہت ہے
 دوسرے مصرع کا واضح مطلب یہ ہے کہ جامہ احرام کا شراب میں
 آلودہ ہونا اس بات کی بڑی گواہی ہے کہ میں کس قسم کا انسان ہوں اور مجھے
 کہاں تک اپنے آپ کو پاکیزہ کرنا ہے۔ لیکن پاکیزہ کرنے کا یہ عزم ہی کوئی
 معمولی چیز نہیں ہے۔ اس سے غالب کے غلو ص نیت کا پتا چلتا ہے۔ یعنی شرم
 دلانے اور غیرت کو جنگلے کے لیے جامہ احرام کا شراب میں آلودہ ہونا بہت
 بڑی چیز ہے۔ اور یہ اعتراف محض ذہنی کلامی نہیں اس میں عمل پیرا ہونے کی
 خواہش بھی پوری طرح موجود ہے۔ جو غالب کی روشن ضمیری کو واضح کر رہی
 ہے۔

شوق فضول

مولانا سجاد رضوی مرحوم سے میرے دیرینہ تعلقات تھے اس زمانہ سے جب مولویت اذکر بھی ان کے پاس سے نہیں گزری تھی۔ بیروت سے واپس آئے تب بھی کبھی کبھی ملاقات ہوتی اپنی لہنائی بیگم کا بہت ذکر کرتے تھے لیکن آج آٹھ سے دس سال پہلے جب وہ میرے گھر کے پاس آگئے تھے میں نے انہیں کبھی خوش و غرم نہیں دیکھا۔ ازدواجی زندگی نے ان کا حلیہ بگاڑ رکھا دیا تھا لیکن منبر پر بیٹھتے تو ان کی گونج اور گرج کچھ اپنے ہی انداز کی تھی۔ بہر حال مرنے سے چند روز پہلے میرے گھر آئے اور مسکراتے ہوئے کہنے لگے "سنا ہے مشکور اب تم غالب کی ابیات پر کوئی کتاب لکھ رہے ہو۔" میں نے عرض کیا "جی ہاں صرف غالب کی ابیات پر نہیں بلکہ غالب کے ذوق ابیات پر۔" بولے "سنا ہے تمہارا یہ دعویٰ بھی ہے کہ غالب نے اپنے اردو دیوان کے ہر شعر میں ابیات کا بھی کوئی نہ کوئی پہلو رکھا ہے۔" عرض کیا "مولانا ایسی کوئی بات نہیں البتہ میں نے یہ ضرور کہا ہے کہ غالب کی قریب قریب ہر غزل میں کوئی نہ کوئی شعر ابیات کا ضرور نکل آتا ہے۔" کہنے لگے "بات ایک ہی ہے ذرا اس شعر میں غالب کے ذوق ابیات کا کوئی پر تو مجھے نکال کر دکھاؤ تو میں تمہیں مان جاؤں گا اور وہ شعر یہ ہے۔"

رندانہ کی شرط بھی عائد کر دی جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس شوق فضول کے بارے میں صرف باقیں ہی نہیں بننا۔ اس کو عمل میں بھی لانا ہے۔ جرات رندانہ کے یہاں معنی بڑی وضاحت کے ساتھ ہمیں یہ بتا رہے ہیں جس طرح ایک رند آزادو بے خوف اور کچھ کر گزرنے والا ہوتا ہے اس طرح کی جرات ہمیں درکار ہے۔ شاید آپ یہ سن کر بھی حیران ہوں کہ رندی کا تعلق بھی براہ راست اہلیات سے ہے کہ رند کی ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے براہملا کہنے کی کوئی پرواہ نہیں کرتا لیکن اس کا دل اندر سے صاف اور آئینہ کی طرح شفاف ہوتا ہے۔“

مولانا اپنے مزاج کے خلاف ایک دم اچھل کر بولے ”مگر اے مشکور حسین یاد تم شعر زیر بحث کے پہلے مصرع کو کہاں لے جاؤ گے جو اعلان کر رہا ہے ”اس لب کامل میں جائے کا بوسہ کبھی تو ہاں“ میں نے کہا ”حضرت غالب کی یہی ضروری ہے اور چالاکی بلکہ سبکدستی ہے کہ وہ بظاہر عام آدمی کے لیے شعر کہتا ہے اور ایسی زبان میں کہنے سے بھی باز نہیں آتا کہ وہ کبھی کبھی بازاری نظر آتی ہے لیکن اس بازاری زبان میں بڑی بڑی کیف آدر اور معنی آفرین غلو تیں سانس لے رہی ہوتی ہیں۔ شعر زیر بحث کے سیدھے سادھے معنی تو یہی نکلتے ہیں کہ غالب اپنے کسی دوست کو سمجھا رہا ہے اور نہ صرف سمجھا رہا ہے بلکہ اس کو باقاعدہ تدبیریں بھی بتا رہا ہے کہ بھائی میاں گھبراؤ نہیں تمہیں تھمارے اس معشوق کے لب کا بوسہ ضرور مل جائے گا۔ بس ذرا شوق فضول سے کام لو یعنی اس معشوق کے پیچھے چڑے رہو اور پھر صرف پیچھے ہی نہ چڑے رہو ذرا ہمت اور جرات سے بھی کام لو تمہیں کامیابی ابدیٰ حاصل ہو گی۔“

”اس لب سے مراد کیا ہے؟“

”کوئی بھی ہدف جس کو حاصل کرنے کے لیے آپ اسی طرح شدت جذبہ اور گہرے لگاؤ کا مظاہرہ کر رہے ہیں جس طرح آپ کسی دو شیزہ کے لب

کا بوسہ لینے کے لیے بے قرار اور جوش میں بھرے پڑے ہوں اور اگر فرض کریں-----

”کیا فرض کریں عام دوشیزہ کے لب کا بوسہ؟“

”جی ہاں۔“

”گویا آپ اللہ میاں کو حاضر ناظر جان کر کسی دوشیزہ کے لب کا بوسہ لینے پر تلے ہوئے ہیں۔“

”اس میں بھی کیا حرج ہے۔ یہی تو میں کہہ رہا ہوں اور میں بھی کیا غالب کہہ رہا ہے کہ Sex کو آپ نے محض تکلف اور بلائی میں بری چیز کیوں سمجھ لیا ہے جب کہ آپ کے دل میں دوشیزہ کے لب کے بوسے کے تصور ہی سے لذو پھوٹ رہے ہیں۔“

”مطلب یہ ہے کہ تم اور تمہارا غالب Sex کو پاک و پاکیزہ بنانے پر ڈٹ گئے ہیں۔“

”جناب مولانا نکس کو ہم کیا پاکیزہ بنائیں گے یہ تو خود اللہ تعالیٰ نے اسے یہ اعزاز بخش رکھا ہے۔ اب آپ کے سامنے یعنی سورج کو میں کیا چراغ دکھاؤں کیا ہمیں یہ ہدایت نہیں ہے کہ جب میاں پیروی تخلیقی عمل کے لیے ایک دوسرے کے قریب آئیں تو اللہ کا نام لیں یعنی بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر اس کیف اور تخلیقی عمل کا آغاز کریں۔ اس کے بعد کسی کے لبوں کا بوسہ لینے کا عمل تو زوجین کے تخلیقی عمل سے کہیں زیادہ معصوم اور لطیف و دل رہا ہے۔“

مولانا بولے ”مکتور تم غالب کی زبان میں یہ کہنا چاہتے ہو کہ نعتی نہیں ہے بارہ و ساغر کے بغیر۔“

”میرا خیال ہے نکس کے ہارے میں تو براہ راست ہدایات دی گئیں ہیں۔ ویسے غالب کے زیر بحث شعر کا واضح ترین مضمون یہی ہے کہ جس مقصد کو

جس ہدف کو بھی حاصل کرو اس کے حصول میں مسلسل ایک لطف کا احساس ہوتا چاہئے جس طرح کسی کے لب کا بوسہ لینے کے لیے ہم مسلسل کیف میں ڈوبے رہتے ہیں۔"

اس کے بعد مولانا انھ کھڑے ہوئے کہنے لگے "مجھے پان ہوانے جانا ہے۔" اور آخر میں کہنے لگے "یار غالب پر تمہاری یہ کتاب نہایت دلچسپ ہو گی اور غالب ہی کے ضمیمے تمہارے ذوق الہیات کی بھی لوگ انشاء اللہ خوب داد دیں گے۔" غالباً" مولانا سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ میں اس کے بعد لاہور سے تھران چلا آیا کچھ دنوں بعد پتا چلا کہ مولانا سجاد رضوی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ویسے اللہ کو تو وہ زندگی میں بھی پیارے تھے ہم لوگوں ہی کو ایسے درویش منش سیدھے ساوھے انسان کو سنبھالنا ضمیمے آیا۔ یوں تھوڑی بہت کوتاہیاں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں۔

مولانا سجاد رضوی دروازے سے باہر نکل چکے تھے جب میں نے ان سے کہا اب آپ پان ہوانے چلے جائیں لیکن میں آپ کو پھر کبھی اس شعر میں جو ترکیب جرات رندانہ استعمال ہوئی ہے اس کی مزید عمدہ اور عارفانہ توضیح فرماؤں گا۔"

رک کر بولے "پھر کیوں ابھی بتاؤ الو۔"

میں نے کہا "رند کا مطلب آپ سمجھتے ہیں رند اصل میں اس خدا کے بندہ کو کہتے ہیں جو لوگوں کی پرواہ نہیں کرتا لیکن اللہ کی راہ میں جو کام کرنا چاہتا ہے بے ہاک ہو کر کرتا ہے۔"

"گویا آپ مجھے یہ بتانا چاہتے ہیں اس لب کا بوسہ حاصل کرنے کے لیے خدا کے بندوں کی سی جرات دکھانی چاہئے۔"

"جی ہاں۔"

مسکرا کر بولے "ہات بے حد مزیدار ہے بشرطیکہ تمہاری طرح کوئی

Sex کی پاکیزگی اور اس کے تقدس کا قائل ہو۔"

"نیکس کے تقدس کا ہر کوئی قائل ہے اگر یہ نام نسلو خاص لوگ اس کو قائل رہنے دیں۔"

مولانا بولے "بات کو سمجھا رہے ہو۔"

"بات کو میں نہیں سمجھا رہا بلکہ بات خود گھوم رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

غالب کا یہ کہنا صد فی صد درست ہے کہ اس لب کا بوسہ مل سکتا ہے لیکن شوق فضول اور جرات دہانہ کے ذریعے اور یہ دونوں چیزیں آدمی کو خدا سے قریب کرتی ہیں۔ اگر آدمی سنبھل کر سوچے تو نیکس سے بڑھ کر خدا سے قریب آدمی کو کون لا سکتا ہے۔

جمالیات اور جہلیات تو آپس میں گندھے ہوئے نظر آ رہے ہیں لیکن ایسات کہیں نظر میں نہیں۔ جی ہاں بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے لیکن اگر اس میں ایسات شامل حال نہ ہو تو جمالیات اور جہلیات اس طرح آپس میں ایک جان دو قالب کبھی نظر نہ آئیں۔ یہ جو اس شعر میں آپ کو تمام حسن و جمال کی فضا پیدا ہوتی نظر آ رہی ہے یہ سب کچھ ایسات کا صدقہ ہے۔ وہ کس طرح؟ یہ بھی سن لیجئے۔ آپ جانتے ہیں جیسے ہی انسان کی گفتگو میں یا زبان میں دعا یا بد دعا کا لہجہ پیدا ہوتا ہے ایسات آن موجود ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ جو نخی انسان دعا کی طرف یا بد دعا کی طرف رجوع کرتا ہے سمجھ لیجئے وہ اپنے سے بلند تر ہستی کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ اور یہ بلند تر بلکہ بلند ترین ہستی حقیقت الحقائق کے علاوہ کون ہو سکتی ہے؟

ذرا شعر ذمہ بحث کو دیکھ لیجئے اگر اس شعر میں یہ تین الفاظ "تمہارے آگے آئی" نہ ہوتے تو نہ صرف شعر میں کوئی حسن نہ پیدا ہوتا بلکہ کوئی معنی بھی پیدا نہ ہوتا۔ ویسے آپ ہزار کہتے رہتے کہ تمام عمر جو ہمیں پریشانیاں دی ہیں اے محبوب تمہاری زلفوں کو بھی اسی طرح پریشانیاں دیں گی۔ یا ایک طرف آپ محبوب کی سچے دار زلفوں کا ذکر کر دیتے اور دوسری طرف اپنی پریشانوں کا تب بھی کوئی بات نہ بنتی۔ اگرچہ لفظ پریشانی اور خم بہ خم زلفوں میں ایک مشابہت تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس مشابہت میں تاثیر یا حسن کوئی پیدا نہ ہوتا۔ حسن اور تاثیر تو شعر میں اس وقت پیدا ہوئے ہیں جب شاعر نے یہ کہا ہے کہ یہ عمر جو ہم نے (تمہاری زلفوں کے خیال میں) اے محبوب پریشانیاں اٹھائیں ہیں خدا کرے یہ پریشانیاں تمہاری زلفوں کے سامنے بھی آئیں۔ اگرچہ یہ ایک طرح کی بد دعا کھلاتی ہے۔ جب ہم کسی کو یہ کہیں کہ جو کچھ تم نے کیا

تھمارے آگے آئے لیکن دیکھ لیجئے غالب نے اس بددعا کو کس خوبصورتی کے ساتھ زلفوں سے وابستہ کر کے دعا بنادیا ہے کیونکہ زلفوں کا پریشان ہونا تو ان کے یعنی زلفوں کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس بظاہر بددعا کا کمال یہ ہے کہ عام طور پر تو دعایا بددعا کا اثر بعد میں ہوا کرتا ہے۔ لیکن اس بددعا کا خوبصورت اثر فوراً یہ ہوا کہ شاعر کو اپنی تمام عمر کی پریشانیاں نہ صرف محبوب کے غمبوسوں کی طرح خوبصورت لگنے لگیں۔ بلکہ ان میں سے خوشبو کی لپٹیں بھی آنے لگیں جی ہاں معافی کی خوشبو کی لپٹیں جذبات کی خوشبو کی مکاریں، زلفوں کے بکھرنے کے مناظر کی چمک اور دمک ایسا فوراً کیوں ہوا؟ اس لیے کہ جیسے ہی شاعر نے اپنی پریشانیاں جی ہاں تمام عمر کی گزشتہ جمع شدہ پریشانیاں کو محبوب کی خوبصورت مسکتی ہوئی زلفوں سے تشبیہ دی تو یہ خوبصورت بددعا دینے والے شاعر کا اپنے لمحہ موجود اس کا اپنا حال یکایک دم گھبرا گیا، تنک گیا اور پھر نہ جانے اس کی گزری ہوئی پریشانیاں میں زندگی کا کون سا حسن و جمال تھا جو اسے موجود نظر نہیں آ رہا تھا۔ یعنی اس خوبصورت اور مسکتی ہوئی بددعا نے تو اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والا حساب کر ڈالا۔ اس حساب چکانے میں تو چمک جھپٹنے کی دیر بھی نہیں لگی۔ تشبیہ و استعارہ تو ہمارے احساسات کو معافی کی چھوٹ کے ساتھ چمکاتے اور دمکاتے تو ہیں ہی لیکن تشبیہ و استعارہ میں ایسا نہ صرف تاثیر کو دوگنا چوگنا کرتی ہے اپنی جگہ برق رفتاری کا کام بھی کرتی ہے۔

شعر زیر بحث میں پہلے مصرع کے اولین لفظ ”یہ“ نے جو عام ساحرہ اشارہ کلاتا ہے۔ کس طرح شاعر کی تمام عمر کی پریشانیاں کو چشم زدن میں زمانہ حال میں لاکھڑا کیا اور پھر ان میں محبوب کی زلفوں کی بے پناہ خوبیوں کا گویا تمام

کا تمام خزانہ الٹ دیا۔ ”یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے“ اے محبوب کے طرہ ہائے خم بہ خم اب تم ان کو سنبھالو۔۔۔۔۔ اور خود بھی پریشان ہو کر ان کے حسن و جمال میں اٹھانے کرتے چلے جاؤ۔۔۔۔۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا ایہات کی ایک ذرا سی شمولیت نے کس طرح شاعر کے ماضی کی تمام تکالیف کو دور کر ڈالا اور پھر نہ صرف اس کا حال سک اور چمک اٹھا اس کے مستقبل کی عاقبت بھی سنورنے لگی۔۔۔۔۔ عاقبت کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے کہ ایہات کا عاقبت سے ایک خاص لگاؤ ہے۔ اور یہ عاقبت ہی تو ہے جو ہمارے ماضی اور حال کو خلعت جاودانی عطا کرتی ہے۔ اور خلعت جاودانی کیا ہے؟ انسان کا مستقبل جو ایہات کا سب سے بڑا تحفہ ہو گا اور ہوتا ہے۔

بغور دیکھا جائے تو ایہات کے بغیر انسان کا مستقبل کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور اگر کوئی معنی رکھتا ہے تو اس کی حیثیت کوئی زیادہ معتبر نظر نہیں آتی۔۔۔۔۔ مستقبل میں اعتبار پیدا کرنے والی چیز ایہات ہی ہے۔۔۔۔۔ کیونکہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ایہات جس یقین کے ساتھ انسان کے مستقبل کی بات کرتی ہے اس طرح کا یقین ہمیں ابھی تک کسی قلمی سے حاصل نہیں ہو سکا۔ رہی یہ بات کہ یہ محض انسان کی Wishful thinking ہے تو ہم انسان کی خواہشوں سے بھری اس سوچ کو بھی بیک نوک قلم منسوخ نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔

پر کشش اشیاء سے اپنے آپ کو بے نیاز کر ڈالے۔ ان کی طرف کوئی توجہ نہ دے ان کو حاصل کرنے کے شوق سے خود کو بچالے۔۔۔۔۔ اور پھر انسان میں یہ بھی حوصلہ اور خوبی ہے کہ وہ اپنے اس ذہد میں پوری طرح غلصہ بھی رہے کسی قسم کے قریب اور ریاکاری سے کام نہ لے لیکن غالب کا کہنا یہ ہے کہ انسان کا ذہد اس کی پرہیزگاری اور پھر اس ذہد اور پرہیزگاری میں اس کا خلوص کوئی معنی نہیں رکھتے اگر انسان اپنے اس ذہد اور پرہیزگاری کے بدلے میں خام اور کپا حتم کا لالچ دکھائے۔ یہاں غالب نے لالچ اور طمع کے ضمن میں ایک بہت ہی لطیف نکتہ پیدا کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ غالب کسی نیکی کے عمل کے بدلے میں فی نفسہ کسی لالچ اور طمع کو برا نہیں سمجھتا۔ اگر وہ برا سمجھتا ہے تو جیسا کہ ذریعہ بحث شعر میں واضح طور پر وہ کہہ رہا ہے کپا اور بغیر سوچے سمجھے کا لالچ ہے۔

کیا ذہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریاکی
پاداشِ عمل کی طمع خام بہت ہے
بری چیز طمع نہیں بلکہ طمع خام ہے۔ گویا غالب طمع کا قائل ہے مگر یہ طمع خام نہیں ہونی چاہئے اور آپ جانتے ہیں طمع خام وہ ہوتی ہے جس میں انسان اپنی جبلت خواہش پر کنٹرول رکھے بغیر طمع کرتا ہے۔ ویسے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ خود لفظ طمع کے معنی بہت زیادہ لالچ کرنے کے ہیں پھر طمع خام کا مطلب کیا ہوا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بقول غالب اپنی جگہ بہت زیادہ لالچ یا طمع کرنا بھی کوئی برا فعل نہیں ہے کیونکہ اگر آپ کسی اچھی چیز کی خواہش کر رہے ہیں تو اس میں مقداریہ تقدار کی پابندی لگانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اچھی چیز اچھی باتیں اچھے خیالات اچھے نسل و جوہر جس قدر بھی جتنے بھی اکٹھے ہو جائیں کم

ہیں۔ لیکن زیادہ تعداد اور زیادہ مقدار کی خواہش میں اگر آپ چیز کی اصل خوبی یا اصل حیثیت کو فراموش کر دیں تو پھر آپ کی یہ طمع صرف خام ہو ہی نہیں جائے گی بلکہ خام ہوتی چلی جائے گی۔۔۔۔۔ طمع خام کی اصل خرابی یہ ہے کہ جب اس کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو پھر رکنے میں نہیں آتا۔

اور آپ جانتے ہیں جب انسان کی طمع خام کا سلسلہ رکتا نہیں تو اس کی زویراہ راست اہمیات پر جا کر پڑتی ہے۔ اور اہمیات پر زوہڑنے کے معنی یہ ہیں کہ پھر انسان تنگ نظر اور تنگ دل ہو جاتا ہے۔ حرصت فکر و عمل کی سب سے بڑی دشمنی انسان کی طمع خام ہوتی ہے۔ جتنا آدمی طمع خام میں جھلا ہوتا چلا جاتا ہے اتنی ہی اس کے حرصت فکر و عمل کی صورت مسخ ہوتی چلی جاتی ہے۔ جدید ترین نظریات فکر و عمل کے ساتھ یہی ہو رہا ہے کہ انسان اپنی طمع خام کو خام نہیں سمجھتا بلکہ اس کو آزاد خیالی کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔ جس کے باعث صحیح معنی میں نہ اس میں آزاد خیالی پیدا ہوتی ہے اور نہ کشادہ قلبی۔ البتہ آزاد خیالی اور کشادہ قلبی ان دونوں اعلیٰ انسانی صفات میں ایک خاص نوعیت کی بے راہ روی ضرور آگئی ہے جس کو انسان اپنی نادانی کے باعث روشن ضمیری سمجھ بیٹھا ہے۔ اور یوں اپنی اپنی عقل اپنا اپنا رنگ کا ساں پیدا ہو گیا ہے۔ جدید ترین اعلیٰ نظریات میں قدر مشترک قسم کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ آپ اس شہیدہ نگاہ کو پھر ایک آزاد خیالی قسم کی کوئی چیز قرار دے کر اپنے دل کو جھوٹی قسم کی تسلی دیں اور خوش ہو جائیں کہ ہم بھی کوئی اعلیٰ اقدار کے قائل انسان ہیں یا روحانیت سے بھی کوئی بڑی چیز ہم میں پیدا ہو رہی ہے۔

زیر بحث شعر میں غالب کی سب سے بڑی فریاد یہی ہے کہ انسان کے زہد کو اس کی پرہیزگاری کو اس کے خلوص اور عبادت کو جو چیز جاہ و برہاد کر کے

رکھ دیجی ہے وہ اس کی طمع خام ہے مکرر عرض ہے کہ یہاں اس امر کو بھی پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے کہ غالب طمع کی مخالفت نہیں کر رہا طمع حرم و لالچ کو وہ انسان کی صفت خاص گردانتا ہے۔ طمع حرم اور لالچ وہ صفت ہے جو صرف اور صرف انسان کو ودیعت کی گئی ہے۔ دوسرے جاندار اس صفت سے محروم ہیں۔ لیکن جس طرح طمع انسان کی شناخت کے ضمن میں اس کی صفت خاص ہے اسی طرح اس صفت خاص کو انسان کے لیے سنبھالنا بھی ایک بہت بڑا اور نازک و اہم مسئلہ ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ انسان اپنی طمع اپنے لالچ کی بطور خاص نگرانی کرتا۔ لیکن عموماً ابھی تک ہو یہ رہا ہے کہ انسان اپنی اس صفت خاص کی طرف سے اچھی خاصی غفلت کا ثبوت دیتا چلا آ رہا ہے۔ اور یہ اسی غفلت کا نتیجہ ہے کہ آج تک انسان نے اس ضمن میں کوئی خاص کیا ایک طرح دیکھا جائے تو بالکل ترقی نہیں کی۔ اپنی طمع کو نکھارنے سنوارنے اور بنانے کے بجائے اس نے یعنی انسان نے اس کو کھلی پھٹی ہی دے رکھی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ طمع مسلسل خام چلی آ رہی ہے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی خام ہوتی جا رہی ہے۔ ایک اور مصیبت یہ ہے کہ انسان جس قدر زیادہ مادی اعتبار سے یعنی سامانی اعتبار سے ترقی کرتا چلا جا رہا ہے اسی قدر اس کی طمع خام ہوتی چلی جا رہی ہے مظاہر قدرت پر یا فطرت کی طاقتوں پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد تو انسان اس غلط فہمی میں زیادہ جھلا ہوتا جا رہا ہے کہ اب وہ جو چاہے گا اسی طرح ہو سکے۔ اس لیے وہ اپنی طمع یا اپنے لالچ پر کوئی پابندی کیوں عائد کرے لہذا وہی بات کہ اس کی طمع بھتہ یا تربیت یافتہ ہونے کے بجائے مزید ناچختہ اور خام ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اور اسی لیے وہ یعنی انسان اس غلط فہمی میں مزید جھلا ہوتا چلا جا رہا ہے

کہ وہ جو بھی عمل کرے اس کا بدلہ اسے کچھ زیادہ ہی ملنا چاہئے۔ اور اسی لیے اس کی اصل ترقی یعنی اعلیٰ صفات کی ترقی بھی رکھی ہوئی ہے کہ اس کی طبع خام ان اعلیٰ صفات کو بروئے کار نہیں آنے دیتی۔ شعر ذیل بحث میں غالب نے انسان کی اسی صورت حال کا بطور خاص ذکر کیا ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ میں انسان کے ذہن کو اس کی پرہیزگاری کو اس کے خلوص کو کس طرح تسلیم کر لوں جب کہ وہ اپنے اس خلوص اس عبادت اور پرہیزگاری کے بدلے میں بہت ہی پست قسم کے مطالبے کرتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ اپنے ذہن کے بدلے میں چاہتا ہے کہ اسے جنت میں حوریں ملیں، دودھ اور شہد کی نسرں ملیں، عمدہ عمدہ پھل ملیں۔۔۔۔۔ غالب کا کہنا ہے کہ یہ چیزیں تو انسان کو اسی زندگی میں حاصل ہو جاتی ہیں یا حاصل ہو سکتی ہیں۔ اسے اپنے ذہن اپنی عبادت اپنے خلوص کے مرے اور درجہات کے مطابق مطالبے کرنے چاہئیں۔ کہ ان کے مقابلے میں دنیا کی یہ نعمتیں بہت کم حیثیت رکھتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اس طرح اپنی اعلیٰ صفات کو عمل میں لانے کے عوض میں جب معمولی قسم کے مطالبات کرتا ہے تو وہ انسانی زندگی کے اعلیٰ امکانات کے راستے مسدود کر دیتا ہے۔ دنیا کی عام آسائشیں اور لذتوں کا ذکر جنت کے حوالے سے مصلح ایک اشارہ ہے۔۔۔۔۔ ان اعلیٰ آسائشوں اور لذتوں کی طرف جن کا احساس انسان اس دنیا میں نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ جنت کا شہد جنت کا دودھ جنت کی حوریں یقیناً اس دنیا کے شہد، دنیا کے دودھ اور دنیا کی دوشیزاؤں سے ہر طرح بہتر ہوں گی۔۔۔۔۔ اور ان سب اشیاء کے بہترین سے بہترین ہونے کے امکانات بے شمار ہیں۔۔۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ شعر ذیل بحث میں غالب انسان کو اس کے اعلیٰ صفات ہی کا نہیں ایک عام صفت (جو بدنام زیادہ ہے) اس کی طاقت اور اہمیت کا احساس دلا رہا ہے کہ کس طرح انسان اپنی اس صفت یعنی طبع پر توجہ نہیں دے رہا ہے۔

بیگانگی خلق

اس دنیا میں اپنے پرائے کا مسئلہ بہت بڑا مسئلہ ہے اور اسی مسئلے سے پھر انسان کی تمدنی کامیابی سر اٹھاتا ہے۔ انسان کے حوالے سے تمدنی کامیابی اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ یعنی انسان فطرتاً ایک سماجی مخلوق ہے یہ اپنے اپنے جنس سے الگ ہو جائے تو اس کی آدمیت اور انسانیت دونوں ہی خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ لوگ عموماً ایک دوسرے سے بیگانگی اس وقت اختیار کرتے ہیں "اولاً" جب وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اب وہ خود کفیل ہو گئے ہیں یعنی وہ اپنی دولت خرچ کر کے دوسرے اپنے جنس کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔ یا پھر اگرچہ پوچھا جائے تو انسان کی اصل اپنائیت اور اصل رفاقت یہ ہے کہ آپس میں ان کے خیالات ملتے جلتے ہوں۔ فکری ہم آہنگی بطور خاص انسان کے لیے بے حد ضروری ہے۔ لیکن فکری ہم آہنگی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کوئی ایک دوسرے کے خیالات سے اختلاف ہی نہ کرے۔ فکری ہم آہنگی کی اصلیت یہ ہے کہ آدمی ایک دوسرے کے خیالات کے اختلاف کو برداشت کرنا جانتا ہو۔۔۔۔۔ اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا ہو جائے تو آدمی میں

عموماً "پوری زندگی کو حوصلے سے گزارنے کی جرات و ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح جہاں ایک ذہین آدمی سب کے اختلاف کو برداشت کرنے کی ہمت رکھتا ہے وہاں دوسرے لوگ اس کے اختلافات کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔

ایسے ہی موقع کے لیے غالب نے مندرجہ ذیل شعر کہا ہے۔

بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب

کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

لیکن یہ شعر صرف خاص لوگوں کے لیے ہی نہیں ہے عام لوگوں کے لیے بھی ہے کہ لوگ اپنا بننے کے بجائے غیر جلدی سے بن جاتے ہیں۔ انہیں دوسروں کے معمولی معمولی اختلافات کو برداشت کرنا بھی نہیں آتا اور یوں بیگانہ اور غیر چنے کی اصل وجہ یہ بنتی ہے کہ انسان خود غرضی کے تحت دوسروں کے بارے میں زیادہ نہیں سوچتا۔ نہ ان کی صورت حال پر غور کرتا ہے اور نہ ہی ان کے مزاج اور طبع کی رٹا رنگی اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔ مگر جب لوگ ایک انسان کو اس طرح چھوڑ دیتے ہیں تو ایسے وقت میں ایک حساس آدمی کا دل بہت زیادہ گھبراتا ہے۔۔۔۔۔

ایسی ہی صورت حال کے لیے غالب نے یہ شعر کہا ہے جس میں انسان کے تھا ہونے کا اظہار بھی ہے اس کا علاج بھی ہے اور لوگوں کی فطرت کے بارے میں بھی اصل بات بتائی گئی ہے۔ اور اس صورت حال کا علاج غالب نے وہی بات کہ اپنے ذوق امیہات کے تحت ہمیں یہ بتایا ہے کہ اے غالب تو اس بات پر قطعی طور پر بیدل پریشان اور مایوس نہ ہو کہ تجھے سب لوگوں نے تھا چھوڑ دیا ہے۔ یا سب لوگ تجھ سے فیروں کی طرح برتاؤ کرتے ہیں، تیرے

مزاج کو نہیں سمجھتے۔ تیرے ذہن کو نہیں سمجھتے تیرے دل کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے لیکن تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ تیرا خدا ایسا ہے جو لوگوں کے دلوں کے رازوں تک کو اچھی طرح جانتا ہے لہذا اگر کوئی تیری بات کو نہیں سمجھ پا رہا ہے جس کی وجہ سے تو اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہے اور لوگوں کو بیگانہ سمجھ رہا ہے اور لوگ بھی تجھے غیر سمجھتے ہیں تو اس میں کھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں جب تیرا خدا تیری ہر بات کو جانتا ہے تو کوئی اور تیرا اپنا ہو یا نہ ہو خدا تو تیرا ہے۔۔۔۔۔ اور وہ اس طرح تیرا ہے جس طرح کہ تیری جان تیری ہے۔

شعر زیر بحث میں لفظ جان اس خوبی اور شعور کے ساتھ استعمال ہوا ہے کہ جس کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب۔۔۔۔۔

کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے۔۔۔۔۔ ذرا غور کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دو سرا مصرع کوئی نور نہیں کہ رہا ہے خدا خود اپنے بندے کو قسلی دے رہا ہے اور اس پیار کے ساتھ قسلی دے رہا ہے کہ اس طرح کا پیار خدا کی ذات کے علاوہ ہم کسی دوسرے سے توقع Expect نہیں کر سکتے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ غالب کے ذوق الہیات کے تربیت یافتہ ہونے کی ایک بہت واضح دلیل ہے۔ خدا اپنے بندوں سے کس قدر پیار، کس قدر محبت کرتا ہے اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں کیونکہ آدمی اپنے اہائے جنس کی روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کے زعمے میں اس طرح گھرا رہتا ہے کہ اسے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اللہ کی بے پناہ اور لامحدود محبت کا اندازہ لگاسکے۔

غالب نے زیر بحث شعر میں اپنے بندوں کے لیے اللہ کی بے کراں محبت کو اس سادگی اور بے ساختگی سے واضح کیا ہے کہ پھر وہی بات کہ غالب کے ذوق الہیات کی داد دینا بھی کوئی آسان کام نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔ بیگانگی

خلق کو دور کرنے کے لیے اللہ کی طرف رجوع کرنا گویا ایک اعتبار سے انسان کا صحیح معنی میں اپنی آزاد خیالی روشن ضمیری اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اور اسی مظاہرے سے حرمت فکر و عمل کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اسے بندے اگر لوگوں کی تنگ دلی اور تنگ نظری نے تجھے اپنے سے غیر سمجھ لیا ہے تو کیا ہوا تیرے لیے خدا کی وسعتیں ان وسعتوں کے آفاق ہر وقت حاضر ہیں۔

بھلائی کے نرنے میں

غالب کا ایک بہت مشہور عام اور سیدھا سادہ سا شعر ہے لیکن اس سے غالب کے ذوق الہیات کے کتنے پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں یہ بھی کوئی کم دلچسپ اور خوبصورت بات نہیں ہے اور اس میں دلچسپی اور خوبصورتی کے صفات اس لیے پیدا ہوئے ہیں کہ اس شعر کا تعلق براہ راست الہیات سے ہے۔ وہ عام سا شعر یہ ہے۔

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا
اور درویش کی صدا کیا ہے

اس شعر کے پہلے ہی لفظ ”ہاں“ سے (جو محنگلو میں عام استعمال ہوتا ہے) پتا چل رہا ہے کہ شعر زیر بحث میں جو بات کہی جا رہی ہے اس پر کہنے والے کو بہت یقین ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بات کہنے والا بڑے وثوق کے ساتھ بات کہہ رہا ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لفظ ہاں سے یہ بھی پتا چل رہا ہے کہ جو بات کہی جا رہی ہے اس پر سننے والے کا پہلے کوئی خاص یقین نہیں تھا۔ اور بات بھی ٹھیک ہے۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ اس دنیا میں

بھلائی کے بدلے بھلائی کب حاصل ہوتی ہے۔ اس کے جواب میں سمجھانے والے نے غالباً "کافی کچھ سمجھا کر کہا ہے ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا۔ یعنی ہاں کا لفظ بھلائی کے عمل کے لیے پورے یقین کے ساتھ دعوت دے رہا ہے گویا کہا جا رہا ہے کہ ہاتھ نکٹن کو آر سی کیا۔ بھلائی کر کے دیکھو۔۔۔۔۔۔ تمہیں اس کے صلے میں بھلائی مل جائے گی۔ دوسرے مصرع کو پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا واپی بات ایک خدا رسیدہ اور توحید پرست انسان کی زبان سے نکلی ہوئی ایک صدا ہے جس کو ہم عام قسم کی آواز اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ صدا کے معنی اس آواز کے ہیں جو کسی بڑی چیز مثلاً "پھاڑ وغیرہ سے نکرا کر نکلتی ہے۔ یوں گویا صدا میں گونج ہوتی ہے یا تو بلندی کی اگر وہ پھاڑ وغیرہ سے نکرا کر واپس آئے اور یا پھر اس صدا میں گمراہی ہوتی ہے اگر وہ کنوئیں سے نکل کر آرہی ہے۔ چونکہ درویش اپنی ذات میں پھاڑ بھی ہوتا ہے اور ایک گمراہ کنواں بھی کہ درویش اس شخص کو کہتے ہیں جس نے اللہ کے در کو مضبوطی کے ساتھ سنبھالا ہوا ہے۔ گویا درویش توحید پرستی کی ایک بہت بڑی علامت ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے درویش کی صدا میں بلندی بھی ہوتی ہے اور گمراہی بھی۔ اسے اپنے تجربہ اور شعور کی بدولت پورا پورا یقین ہوتا ہے کہ اگر کوئی کسی دوسرے کے ساتھ ایسے سلوک کے ساتھ پیش آتا ہے تو اس کے بدلے میں اسے بھی بھلائی کا سلوک حاصل ہو گا۔ بھلائی کے بدلے میں برائی نا کبھی کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس نا کبھی کا علاج یہی ہے کہ بھلائی کرنے والا اپنے بھلائی کے رویہ میں ذرا تبدیلی پیدا نہ کرے بلکہ اس کے برعکس وہ بھلائی پر زیادہ مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جائے۔

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا۔ کا مطلب یہ ہے کہ بھلائی کرنے والا بھلائی کرنا

کیوں ترک کرے کہ برائی کرنے والے کی ناکھی کو دور کرنے کا ایک ہی موثر ترین طریقہ ہے۔۔۔۔۔ اور پھر جب بھلائی کی ترغیب دینے والا درویش یعنی توحید پرست آدمی ہو تو بھلائی کے علاوہ اس کی کوئی دوسری صدا ہو ہی نہیں سکتی کہ توحید کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اس کے ذریعہ بھلائی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ابھی تک دنیا میں بھلائی عام کیوں نہیں ہوئی؟ اس لیے کہ توحید عمل میں آنے کے ضمن میں عام نہیں ہوئی ہے۔ توحید کو انسان حلیم تو کرتا ہے اس پر عمل نہیں کرتا۔ عمل کیوں نہیں کرتا؟ اس لیے کہ توحید پر عمل کرنے کے لیے صرف اسے زبانی طور پر ماننا کافی نہیں۔ اس کو تجربے میں لانا ضروری ہے۔ اور اس کا احساس انسان کو اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ عموماً "کو تاہ نگاہی کو اپنا شعار بنائے رکھتا ہے۔۔۔۔۔ دل و نگاہ میں وسعت پیدا کرتے ہوئے اسے خوف آتا ہے اور درویش تم سے کچھ نہیں چاہتا اس کی تو ایک ہی صدا ہے ایک ہی درخواست ہے ایک ہی گزارش ہے کہ تم بھلائی کرتے چلے جاؤ اس کے بدلے میں تمہیں یقیناً "بھلائی حاصل ہوگی۔ ہاں یہ ضروری نہیں کہ جس شخص کے ساتھ تم نے بھلائی کی ہے وہ اس کا بدلہ تمہیں بھلائی ہی سے دے۔۔۔۔۔ بھلائی کے بدلے میں بھلائی عام طریقے سے حاصل نہیں ہوتی وہ تو بس حاصل ہو جاتی ہے جس طرح آپ کے ساتھ بست سے اتفاقات پیش آتے رہتے ہیں اسی طرح بھلائی بھی حسن اتفاق سے حاصل ہوتی ہے لیکن یہ بات یہی ہے کہ بھلائی کے بدلے میں آپ کو بھلائی ملتی ضرور ہے۔۔۔۔۔ "اور درویش کی صدا کیا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی یکتائی کو ماننے کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نکلتا ہی نہیں ہے کہ اس پر ایمان لانے سے بھلائی کے دلانے مکمل جاتے ہیں۔ اور ہمارے جسم و جان کو سرسبز و شاداب کرتے چلے جاتے ہیں۔۔۔۔۔

بھلائی کو عام کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ بھلائی کے علاوہ اور کچھ سوچیں ہی مت۔۔۔۔۔ انسان کی مثبت سوچ کو فروغ دینے میں مثبت انداز نظر کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے اور اب تو دنیا اس حقیقت پر بڑے وثوق کے ساتھ سوچنے پر تیار ہوتی جا رہی ہے کہ سوچنا خود ایک عمل ہے اس لیے کیوں نہ اس عمل کو صرف اور صرف بھلائی کے لیے وقف کر دیا جائے۔۔۔۔۔ دنیا میں برائی کا سوال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان بھلائی کے بارے میں سوچنا بند کر دیتا ہے۔ اور انسان بھلائی کے بارے میں سوچنا کب بند کرتا ہے جب وہ اپنے دل و نظر کے لیے حریت فکر و عمل کے آفاق کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

درویش کے ایک معنی گلی گلی میں صدا لگانے والے شخص کے بھی ہیں۔ ان معنی کے پیش نظر تو غالب کے زیر بحث شعر کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ گلی گلی میں بھلائی کی صدا گونج رہی ہے۔۔۔۔۔ ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا۔ اور درویش کی صدا کیا ہے۔ دوسرے مصرع کے پہلے ہی لفظ ”اور“ نے بھلائی کو چاروں طرف سے اس طرح گھیرا ہے کہ ہمیں انسان کے انفس و آفاق میں بھلائی کی گونج کے علاوہ اور کچھ سنائی ہی نہیں دیتا۔ جس طرح پہلے مصرع کے لفظ ”ہاں“ سے بھلائی کی ترغیب خوش تدبیر کا آغاز ہوتا ہے اسی طرح دوسرے مصرع کے پہلے ہی لفظ ”اور“ سے بھلائی ساری کائنات پر گھنگور گھٹا کی طرح نہیں صبح درخشاں کے مانند چمکتی ہوئی اور اپنے اچالے برسائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں اللہ کو ماننے کا مطلب بھلائی کو لامحدود ماننے کے حرافہ ہے اور ہم بھلائی کو اس بے کرائی کے ساتھ اس وقت تک نہیں مان سکتے جب تک ہمارے قلب و نظریں وسعت پیدا نہیں ہوتی اور قلب و نظریں اس وقت تک وسعت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک ہم نہایت غلو ص کے ساتھ حریت فکر و عمل کے قائل نہیں ہو جاتے۔

ناز خود آرا

میں اس وقت غالب کے جس شعر پر بات کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے۔

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یوں
بے شانہ صبا نہیں طرہ گیواہ کا

اس شعر کے پہلے مصرع میں غالب نے انسان کی فطرت کے بارے میں اور انسان کی انا کے بارے میں ایک بہت ہی بنیادی بات کہی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ غافل اور لاپرواہ انسان اس وہم میں بری طرح مبتلا ہے کہ وہ اپنی کوشش اور اپنے عمل سے اس دنیا کو بہت بنا اور سنوار رہا ہے۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ اسی زیر بحث شعر کے دوسرے مصرع میں غالب انسان کی انا کے اس دھم کو اس طرح کٹ دیتا ہے۔

بے شانہ صبا نہیں طرہ گیواہ کا

اس دنیا کی بڑی چیزوں کا تو ذکر ہی کیا اس کے گھاس کی معمولی سی پتی کو بنانے سنوارنے کے لیے ہر روز بلکہ ہر وقت ہوا کے جھونکے اپنے شانے لیے حاضر رہتے ہیں۔۔۔۔۔ گویا اس کائنات کو خوبصورت رکھنے کے لیے

قدرت نے خود اپنی طرف سے اپنے کارندے چھوڑے ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں انسان خواہ کھواد اپنے آپ کو کوئی کریڈٹ دینا چاہتا ہے تو یہ ایک بالکل الگ بات ہے ورنہ آسانی کے ساتھ مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ قدرت ایک معمولی سے گھاس کے پتے کا بھی خیال رکھتی ہے۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ انسان کے سامنے اس کی سعی کو بروئے کار لانے کے لیے دو اقلیم موجود ہیں۔۔۔۔۔ ایک اقلیم ظاہر اور دوسرے اقلیم باطن۔۔۔۔۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ابھی تک انسان نے تین دو جولاں گاہوں میں سے صرف ایک جولاں گاہ اقلیم ظاہر کی طرف توجہ دی ہے اور اسی اقلیم ظاہر یعنی دنیا کو وہ بتائے سنوارنے میں مصروف ہے۔ جب کہ بقول غالب اس خارجی دنیا یعنی اس کائنات کو اتنا بتائے سنوارنے کی ضرورت نہیں یہ کام تو قدرت نے بہت کچھ اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔۔۔۔۔ بلکہ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو انسان نے اس دنیا کو بنایا اور سنوارا کم ہے اور اس کی جہاں و برہاں کا سامان زیادہ کیا ہے۔۔۔۔۔ علامہ اقبال نے پیام شرق کی ایک نظم منظرہ مابین خدا و انسان میں واضح انداز میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔

خدا کہتا ہے۔

جہاں	را	زیک	آپ	و	گل	آفریدم
تو	ایران	و	آباد	و	زنگ	آفریدی
من	از	خاک	پلاؤ	و	تاب	آفریدم
تو	شمشیر	و	حیر	و	تنگ	آفریدی
حیر	آفریدی	نیل	چمن	را		
قلم	ساختی	طائر	نغمہ	زن	را	

اصل بات پر غور کیے بغیر اصل بات کو سمجھے بغیر اپنے ایسے کارناموں پر فخر کرتا ہے جس پر اسے فخر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہی بات کہ جہاں تک اس دنیا کو بنانے سنوارنے کا سوال ہے اس کے لیے قدرت نے اس قدر عمدہ انتظام کیا ہوا ہے کہ ایک معمولی سی گھاس کی پتی کی زلفوں میں سنگھمی کرنے کے لیے ہوا محصور ہے۔۔۔۔۔۔ ”بے شانہ صبا نہیں طرہ گیاد کا“ اس مصرع میں ”طرہ گیاد کا“ کہہ کر جو گھاس کی پتی کی اہمیت اور حسن و جمال کو واضح کیا ہے اس کی داد دینا تو ایک الگ جمالیات کا سوال ہے۔ پورے مصرع کی ساخت پر ذرا توجہ دی جائے تو غالب کے کمال بلاغت کا بھی ایک عجیب اور اک ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ زیر بحث شعر کے پہلے مصرع میں جو انسان کو کہا ہے۔ ”غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے“ یعنی اپنے غافل ہونے کی کیفیت سے باہر نکلے تو اسے معلوم ہو کہ یہ تمام کچھ اس کی غلط فہمی ہے۔ اور پھر وہ سرا مصرع پڑھے تو اس کو اطمینان ہو جائے کہ واقعی میں دنیا کے بنانے سنوارنے پر خواہ مخواہ فخر کر رہا ہوں میرے فخر کرنے کی تو بات کچھ اور ہے۔۔۔۔۔۔

اور وہ بات کیا ہے اب یہاں ہمیں پھر غالب کے کمال بلاغت کی داد دینا ہو گی کہ پہلے مصرع کا صرف پہلا لفظ ”غافل“ ہمیں پوری طرح طرہ سے بھرپور یہ اشارہ دے رہا ہے کہ انسان کی اصل جولاں نگاہ اس کا اقلیم باطن ہے جس کی طرف اسے توجہ دینی چاہئے۔ اس اقلیم باطن کے لیے ابھی اسے بہت کچھ کرنا ہے اس طرف تو اس نے آج تک پوری طرح توجہ ہی نہیں دی۔۔۔۔۔۔ اور وہ اقلیم ظاہر کی طرف ہی اپنی ساری توجہ مبذول کرتا رہا جس کی اسے اتنی ضرورت نہیں تھی۔۔۔۔۔۔ اقلیم باطن کے معاملات سنو جائیں تو اقلیم ظاہر خود جنت کا نمونہ بن جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ انسان کی اصل تاریخ تو اسی

وقت سے شروع ہوتی ہے جیسے ہی وہ اپنے اقلیم باطن کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔
 لیکن غالب کے ہزار اور آرت کا یہ پہلو ہم کسی طرح نظر انداز نہیں کر
 سکتے کہ اس نے کس طرح اقلیم ظاہر کے بارے میں بات کر کے اقلیم باطن کی
 طرف ایک نہایت تیز و طرار بلغ اشارہ دیا ہے۔۔۔۔۔ کہ اے غافل انسان
 اپنے ظاہر سے زیادہ تجھے اپنے باطن کی طرف توجہ دینے کی ضرورت
 ہے۔۔۔۔۔

غالب کی ولایتِ سخن

میں عام مفہوم میں غالب کے ولی ہونے کا تو بالکل قائل نہیں ہوں۔ لیکن اس کی یعنی غالب کی ولایت کا بہر طور قائل ہوں۔ بلکہ اصطلاحی معنی سے قطع نظر میں تو غالب کی ولایتِ سخن کو ولایتِ فقیہ تک کا درجہ دینے کو چار ہوں۔ کیونکہ ولایت اور فقیہ ہر دو لفظوں کے لغوی معنی کے پیش نظر غالب نے اپنی ولایت کو بڑی محنت اور بہت سوچ سمجھ کر حاصل کیا ہے۔۔۔۔۔ غالب کی اہمیت جیسا کہ میں بار بار عرض کر چکا ہوں نہایت مضبوط بنیادوں پر اس لیے قائم و دائم ہے کہ اس نے حریت فکر و عمل کو اپنا لودے کر اس میں شامل کیا ہے۔۔۔۔۔ حریت فکر و عمل غالب کو اپنی جان اور اپنے ایمان سے اس لیے زیادہ عزیز تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کے بغیر نہ جان کوئی معنی رکھتی ہے اور نہ ایمان کے کوئی معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا بہت مشہور شعر ہے اور زبان زد خاص و عام بھی۔۔۔۔۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ - خوار ہوتا

اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ جب ابو ظفر بلور شاہ کے سامنے غالب نے یہ شعر پڑھا تو وہ کہنے لگا ”بہن! ہم تو اس وقت بھی ولی نہ سمجھتے“ اس پر غالب نے فوراً ”جواب دیا“ حضور تو مجھے اب بھی ولی ہی سمجھتے ہیں مگر آپ یہ اس لیے فرما رہے ہیں کہ کہیں میں مغرور نہ ہو جاؤں۔۔۔۔۔“ غالب کے اس جواب سے بھی واضح طور پر پتا چل رہا ہے کہ غالب کو خاص معنی میں اپنے ولی ہونے پر تو کوئی شک کیا ہو سکتا تھا وہ تو اپنی ولایت فقیر کی حدود سے بھی بے خبر نہ تھا۔ وہ اس لیے کہ اسے مسائل تصوف اور اپنے بیان پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی الہیات کو اپنے تجربے میں لاکر مسلسل دیکھنے کا بھی عادی تھا اور اسی طرح تجربے کے اظہار پر بھی اسے قدرت حاصل تھی۔

غالب کی ولایت کو میں وسیع ترین معنی میں ولایت فقیر اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ غالب قطعی طور پر غور و فکر اور گیان و حیا کا آدمی تھا۔ بس اس کے یہاں ایک آنچ کی کسر اس لیے رہ گئی تھی کہ اس نے اس ایک آنچ کو بچا کر رکھنا اپنے عقیدہ کے لیے ضروری سمجھا۔ وہ محمدؐ اور آل محمدؐ کا صحیح معنی میں حقیقت مند تھا اور اس نے ان کی ذوات مقدسہ میں انسان کو اپنے عروج پر دیکھ لیا تھا۔ اس لیے وہ ولی ہونے کو منجانب اللہ ان معنی میں سمجھتا تھا کہ جب تک تربیت رسولؐ براہ راست حاصل نہ ہو کوئی آدمی انسانیت کے اس اعلیٰ مقام پر نہیں پہنچ سکتا جہاں رسولؐ کے زیادہ سے زیادہ تربیت یافتہ اصحاب پاک پہنچ سکے۔

بادہ خواری میں ایک خواری کا امکان اور اندیشہ تو ہر صورت میں موجود رہتا ہے کہ ہزار احتیاط کے باوجود آدمی کسی وقت بھی اپنے حواس کو

فقیر کا قائم رہنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ غالب کی ولایت کا سارا حسن و جمال سارا جاہ و جلال اسی وجہ سے برقرار ہے کہ وہ اپنی تمام تر دنیاواری میں غرق دکھائی دینے کے باوجود دنیاواری میں کم از کم اہل نظر کو غرق نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔ وہ دنیاواری میں کہاں اور کب غوطہ لگاتا ہے اور اسی طرح وہ دنیاواری سے کس مقام پر اور کس وقت صاف بچ کر نکل آتا ہے اس کا اندازہ لگانا ہر کہ وید کا کام نہیں۔ بلکہ بچ پوچھتے تو یہاں بڑے بڑوں نے بری طرح سے ٹھوکریں کھائیں ہیں۔۔۔۔۔ اور جدید دور میں خالص عرصے سے غالب کو مغلوب دکھانے کا جو ایک رجحان چلا آ رہا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اور کچھ نہیں تو اس طرح سے کچھ فہم لوگ غالب کی شخصیت ہی میں کیڑے نکالنے شروع کر دیتے ہیں۔ غالب قمار باز تھا، غالب نہ صرف روضی باز تھا بلکہ اس نے عشق بھی کیا تو ایک معمولی سی ڈومنی سے۔ غالب نے قید بھی کاٹی۔۔۔۔۔ غالب نے انگریزوں کی بری طرح سے خوشامد بھی کی اور وہ بھی صرف اپنی پنشن کی خاطر و غیرہ وغیرہ۔

اصل میں غالب کے دین و دنیا کے استخراج کو حسرت فکر و عمل کی روشنی میں دیکھا جائے اور بڑے حوصلے سے دیکھا جائے تب کہیں جا کر اس کے ولی ہونے کا بھی کچھ پتا چلتا ہے اور اس کی ولایت فقیر کی حقیقت بھی سامنے آتی ہے۔ اس میں تو شک کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں ہے کہ غالب کی ولایت فقیر میں غور و فکر کے بے شمار سورج جھمکاتے ہیں جو ہماری نگاہوں کو مسلسل خیرہ کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے لیے اس ولایت کی حدود کا بھی معلوم کرنا آسان نہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ غالب کی اس ولایت فقیر میں محبت ہمدردی رفاقت کے متوازی ہمت شجاعت ذمہ داری کے ہزار ہا پہلو تو نظر

اس کے علاوہ شعر زیر بحث کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جس معشوق کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ کوئی خیالی معشوق نہیں ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی شخصیت اس قدر پرکشش ہے کہ اسے بلا خوف تردید اس دنیا کا یعنی مجاز کا ایک ایسا حسین ترین نمائندہ قرار دیا جاسکتا ہے جس کے سامنے حقیقت نظر انداز ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ سب کچھ شعر کے لمبے سے پتا چل رہا ہے ورنہ فی الواقع حقیقت کو نظر انداز کرنا مقصود نہیں ہے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مجاز کو نظر انداز کر کے ہم حقیقت کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ اور غالب کی حقیقت پسندی کا عموماً" یہی انداز ہوا کرتا ہے۔۔۔۔۔ اور اس کے یہاں یہ انداز بغور دیکھا جائے تو حریت فکر و عمل کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ آخر خدا پرستی اور وفا کوئی دیواریں تو نہیں ہیں کہ جن کو ہم پھلانگ نہیں سکتے۔ ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ بے وفا سہی۔ لیکن ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اتنے زور دار معشوق کو کسی کے کہنے پر چھوڑ دیں۔ یا اس سے قطع تعلق کر لیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمارے معشوق نے عام لوگوں کے خیال سے اپنی خدا پرستی اور وفا کو چھپانا چاہا ہو۔ کیونکہ عموماً" لوگوں کے ہاں دکھاوے کی خدا پرستی اور وفا شعاری زیادہ ہوا کرتی ہے۔ سچی اور کھری خدا پرستی کی نشانی یہ ہے کہ اس کا سارا زور حریت فکر و عمل پر ہوتا ہے۔ سچا اور کھرا خدا پرست انسان کسی طرح بھی تنگ نظر اور تنگ دل نہیں ہو سکتا۔ غالب کہتا ہے ہمیں معشوق کی اسی اوائے اپنا گردیدہ بتایا ہے۔ زیر بحث شعر کے پہلے مصرع کے دو سیدھے ساوھے لفظوں نے یعنی "ہاں" اور "جاؤ" نے معترضین کے منہ بند کر کے رکھ دیے۔ ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی۔۔۔۔۔ اور دوسرے مصرع نہ یہ واضح کر دیا کہ دین و دل کوئی ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ جن کے آہ پار دیکھا نہ جاسکتا

ہو۔۔۔۔۔۔ غالب کے ذوق الہیات کی یہی وہ حریت فکر و عمل ہے جس کو سمجھنے کے لیے اس کے قاری کو خاصا حوصلہ دکھانا پڑتا ہے۔ اگرچہ اس حوصلے کو حاصل کرنے کے لیے کسی سے کچھ مانگنا نہیں پڑتا اپنے ہی ذہن کے دروازے کھولنے پڑتے ہیں۔ جو کبھی کبھی تو ہوا کے ایک معمولی جھونکے سے بھی کھل جایا کرتے ہیں اور کبھی کبھی زنگ گھٹنے کی وجہ سے ان پر ذرا صبر و تحمل کا تحمل ٹپکانا پڑتا ہے۔

تمنا کا دوسرا قدم

شعر غالب میں طرح طرح سے اس حقیقت کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں کہ آپ کو ذوق الہیات کے بغیر صحیح معنی میں حریت فکر نصیب نہیں ہو سکتی۔ الہیات سے تو حریت فکر اور آزاوی خیال کا چوٹی دامن والا ساتھ ہے۔ مثلاً "حریت فکر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ معنی کے دیرینہ آفاق کی حدود کو توڑتی ہے اور نئی حدود کے تعین کا معاملہ مستقبل کے لیے چھوڑ دیتی ہے۔ لیکن اگر آپ کے پاس ذوق الہیات نہیں ہے تو آپ کسی طرح بھی مستقبل کے ساتھ کوئی قابل اعتبار قسم کا رابطہ قائم نہیں کر سکتے۔ Future is always unseen مستقبل ہمیشہ ناویدہ ہوتا ہے کہنا آسان ہے، اس کے بارے میں کوئی بات تعین سے کہنا مشکل ہوتا تو پھر بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی اسے تو بے خبری اور ناوانی کے زمرے میں سمجھ لیجئے پس اس طرح ذوق الہیات انسان کی بہت سی مشکلوں ہی کو نہیں بہت سی نادانیوں کو بھی ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ اور اسے یعنی انسان کو ایک مضبوط قسم کا مستقبل حوالے کرتا ہے۔ اور اس مستقبل کو ہم محض خیالی اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ اس کی

بنیاد کچھ کر کے دکھانے پر ہوتی ہے۔ اعمال کے بغیر آخرت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اور انسان کے اعمال سے بڑھ کر کم از کم انسان کے لیے ابھی تک کوئی ٹھوس اور قابل اعتبار حقیقت وجود میں نہیں آ سکی۔

ذیل میں ہم غالب کا ایک شعر درج کر رہے ہیں جس کو اس کے یعنی غالب کے دوستوں نے تو اس کے دیوان سے خارج کر دیا تھا لیکن آج کل اس شعر کا بہت شہرہ ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکان کو ایک نقش پا پایا

آپ جانتے ہیں انسان کی تمنا کے بارے میں ایک طرح سے یہ بات فیصلہ کی صورت اختیار کر چکی تھی کہ اس کی یعنی انسان کی تمنا کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ آج ایک ہے تو کل دوسری اور کل دوسری ہے تو پرسوں تیسری اور یوں یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ لیکن شعر زیر بحث میں اس فیصلہ شدہ بات کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا ہے۔ بلکہ ایک طرح سے ختم ہی کر دیا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ انسان کی تمنا کی اس لیے کوئی انتہا نہ تھی کہ امکانات کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن غالب کی حسرت فکر کی جرات و توانائی دیکھئے کہ اس نے یہاں امکانات ہی کو سرے سے خارج از بحث کر دیا۔ مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا۔ اس ضمن میں غالب کا پہلا کام یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے امکانات کو وحدت کے حضور میں لا کر دشت امکان کی بے حد و بے حساب ترکیب وضع کی اور پھر اس کو یعنی دشت امکان کو انسان کے ہمہ وقت رواں دواں دو قدموں کے نیچے نہیں بلکہ ان دو قدموں میں سے صرف ایک قدم ہی کے نیچے رکھا۔ کہ دوسرا قدم تو پہلے ہی اٹھ کر آگے بڑھ چکا تھا۔

اس وقت غالب کے زیر بحث شعر کے مطابق صورت حال یہ ہے کہ جس قدم کے نیچے دشت امکان آیا تھا وہاں بھی اب اس قدم کا صرف نقش باقی رہ گیا ہے۔

ہم نے دشت امکان کو ایک نقش پا پایا
گو یا انسان کی تمنا امکانات سے بھی آگے نکل گئی ہے لیکن خود انسان کو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تمنا کا تو تمام تر تعلق امکانات سے ہے جب امکانات ہی اس کے یعنی تمنا کے ایک قدم کے نیچے آ کر ایک طرح سے ختم ہو گئے ہیں تو اب تمنا کے دوسرے قدم کے نیچے کیا ہے۔۔۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہو کہ اب آدمی کی تمنا اپنے امکانات سے آگے نکل کر کہاں گئی ہے۔۔۔۔۔ تو اس سوال کا جواب صرف وہی ہستی دے سکتی ہے جو ان سب کی خالق ہے، ان کا خیال رکھنے والی ہے، ان کی نگہبان ہے۔ اسی لیے غالب نے اپنی پوری خوش دریافت اور خوش تلاش کو سامنے رکھ کر پکارا ہے۔ ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب؟ اور جیسے ہی یا رب کے الفاظ فضا میں گونجتے ہیں ہمیں پتا چلتا ہے کہ حریت فکر کے ساتھ غالب کس وثوق سے اپنے ذوق الہیات کو کام میں لا رہا ہے اور کس طرح اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ حریت فکر کی آمد رکھنے والا سوائے ذات الہی اور کون ہو سکتا ہے۔

مزید لطف کی بات یہ ہے کہ امکانات کا ایک طرح خاتمہ کرنے کے باوجود غالب نے تمنا کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ اس کے لیے یعنی تمنا کے لیے امکانات سے بھی آگے کی کوئی چیز کے ہونے کی خبر زیر بحث شعر میں دی ہے جس کے بارے میں انسان کے ذوق الہیات کے علاوہ کوئی دوسری صلاحیت کیسے پتا لگا سکتی ہے۔

جب زیر بحث شعر کو پہلی دفعہ سنا تو اس کے حوالے سے میں انسان کی صورت حال کو کچھ یوں سمجھ رہا تھا کہ انسان نے امکانات کو تو اپنے ایک پاؤں کے نیچے دبا رکھا ہے اور دوسرے قدم کو وہ اٹھائے کھڑا ہے کہ اب اس قدم کو وہ کہاں رکھے۔ لیکن مزید غور کیا تو معلوم ہوا کہ دشت امکان پر انسان کے ایک قدم کا نشان رہ گیا ہے باقی اب انسان کا وہ قدم اور دوسرا قدم کہاں ہیں اور خود انسان کہاں ہے اس کی کوئی خبر نہیں۔ گویا غالب ہمیں یہ بتانا چاہتا ہے کہ انسان کی تمنا اس قدر زبردست چیز ہے کہ وہ امکانات سے بھی آگے جاسکتی ہے اور انسان کے پورے مستقبل کا نقش کچھ سے کچھ ہو سکتا ہے۔ اس کا کھوج لگایا جا سکتا ہے مگر وہی بات صرف اسی ہستی سے جو وہ عالم کی خالق ہے اور جو تخلیق کے عمل میں مسلسل مصروف ہے۔۔۔۔۔ کل یوم موفی شان

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے غالب نے دشت امکان کو نقش پا کی کر مرے سے امکانات ہی کو ایک قصہ پارینہ نہیں بنا ڈالا۔ نقش پا کی ترکیب ہمیں یہ اشارہ بھی دے رہی ہے امکانات کا کھوج بھی لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن وہی بات کہ ایک نئے تناظر میں۔ امکانات کو ایک نئی زندگی دے کر ان سے یعنی امکانات سے ایک نئی روشنی لے کر۔۔۔۔۔ کیونکہ نقش پا کی ترکیب یہاں ہمیں یہ بھی بتا رہی ہے کہ امکانات کوئی خیالی چیز نہیں ہیں۔۔۔۔۔ یہ تو کسی کا نقش قدم ہیں۔ گویا غالب نے عجیب فن کاری سے امکانات کو ماضی کی چیز بھی ثابت کر دیا لیکن ماضی کی ایسی چیز جس میں حال ہی میں مستقبل بھی پوری طرح جلوہ گر ہے۔

ہندگی-----سرچشمہ آزادی فکر و عمل

ہات تو عجیب سی لگتی ہے ایک طرف ہندگی ہے اور دوسری طرف میں اس ہندگی کو آزادی فکر و عمل کا سرچشمہ قرار دے رہا ہوں۔ لیکن یہ سب کچھ میں نہیں کہہ رہا ہوں یہ سارا کرشمہ غالب کے ایک شعر کا ہے یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سارا کرشمہ غالب کی شاعری کا ہے۔ پہلے وہ مشہور کرشمہ بڑا شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ہندگی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں ہیں کہ ہم
اٹنے پھر آئے در کہہ اگر دا نہ ہوا

یہ شعر من کر آدمی کے ذہن میں یہ سوال پھر سر اٹھاتا ہے کہ صاحب ایک طرف ہندگی ہے جو فارسی کے مصدر ہستن یعنی بندہ جانے سے ہے اور دوسری طرف کہا جا رہا ہے کہ ہم ہندگی میں بھی آزاد و خود ہیں ہیں۔ بھلا وہ کیسے؟ جی ہاں وہ اس طرح کہ غالب کی ہندگی کسی معمولی ہستی سے تعلق نہیں رکھتی۔ غالب بندہ ہے قادر مطلق کا، سارے عالمین کے حاکم کا، ہر زبان اور مکان کے خالق کا، سب کچھ سننے اور سب کچھ جاننے والے کا، ہر جگہ حاضر و ناظر

رہنے والے کا لامحدود اور بے کراں کا "لغذا اب ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سچ سچ بتائیے جس کا تعلق ایسی عظیم ذات کی بندگی سے ہو وہ آزاد و خود بین نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا۔ ایسی بزرگ و برتر ہستی کا بندہ بننے کا یہی تو سب سے بڑا فائدہ ہوتا ہے کہ اس ہستی کی بہت ساری صفات آدمی میں خود بخود سرايت کرنے لگتی ہیں۔

یہاں زیر بحث شعر کے پیش نظر یہ سوال پھر کیا جا سکتا ہے کہ غالب کے لیے سے تو صاف یہ پتا چل رہا ہے کہ وہ بندگی کے لفظ کو عام معنی ہی میں استعمال کر رہا ہے۔ خصوصیت سے "بندگی میں بھی" کے الفاظ سے ان عام معنی کا واضح طور پر اظہار ہو رہا ہے۔ لیکن غالب کا یہ عام طریقہ ہے کہ وہ روز مرہ کے مضمون سے اپنے خاص معنی پیدا کرتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو لفظ بندگی پر غور کرو۔ اور پھر یہ غور کرو کہ کس بندگی کی وجہ سے ہم آزاد و خود بین بنے ہوئے ہیں فارسی کے لفظ "آزادہ" کے معنی Free Minded آزاد خیال کے تو ہوتے ہی ہیں فارسی میں اس کے معنی اور بھی ہیں Free Born اور خالص Free آزاد۔ اس کے علاوہ آزادہ کے ایک معنی شریف کے بھی ہیں۔۔۔۔۔ اور جیسا کہ غالب خود کہتا ہے کہ تنجید معنی کا طلسم اس کو سمجھئے۔ جو لفظ کہ غالب مرے شعار میں آوے چنانچہ لفظ آزادہ کے تمام معنی زیر بحث شعر میں اپنا اثر دکھا رہے ہیں۔

غالب کہہ رہا ہے کہ تم نے ہماری بندگی کو کیا سمجھا ہے ہم تو اس کی وجہ سے آزاد خیال بھی ہیں خالص آزادی بھی ہماری تحویل میں ہے اور اسی بندگی کی وجہ سے ہم میں شرافت اور وہابیت بھی پیدا ہو گئی ہے اور انہی صفات کی بنا پر ہم اس قدر خوددار ہو گئے ہیں کہ "اٹنے پھر آئے در کعبہ آکر دانہ

ہوا۔ لیکن اس کا مطلب بھی کوئی غلط نہ سمجھے کہ ہم کہتے ہیں کہ کسی غرور و تکبر کے باعث (اس کا در بند ہونے پر) واپس آ گئے بلکہ در کہہ کے بند ہونے کو بھی ہم نے رب کہہ کی رضا سمجھا اور یوں ہماری خودداری میں وہی بات کہ غرور کے بجائے راضی برضا ہونے کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ لیکن اس کیفیت پر ہمیں غرور تو یقیناً نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہم ایسا کرنے پر تیار ہیں البتہ ہم اس کیفیت پر غرور ناز تو کر سکتے ہیں۔ اور زیر بحث شعر میں غرور نازی میں عام آدمی کو ایک واضح سا غرور نظر آ رہا ہے۔ پھر عام آدمی کیا ہمارے مرحوم ڈاکٹر اجمل نے بھی اپنی تمام تر نفسیات دانی کے باوجود اس شعر کو ”جاگیرداری رسم و رواج“ کا نتیجہ قرار دے ڈالا۔۔۔۔۔ دیکھئے ”مقالات اجمل“ صفحہ 183 سطر 3 ناشر ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور۔

ہم نے اب تک شعر زیر بحث کے ایک لفظ آزادہ ہی پر بات کی ہے اس شعر کے دوسرے اہم لفظ ”خود بین“ پر تاحال کوئی بات نہیں کی۔۔۔۔۔ دراصل اگر ہم لفظ آزادہ کے تمام معنی کو اپنے ذہن میں رکھیں تو ہمیں ”خود بین“ کے معنی پر توجہ کرنے کی ضرورت خود بخود محسوس ہوتی ہے۔ جس کا در مطلق کی بندگی نے ہمیں آزادی فکر و عمل کی توفیق بے پناہ بخشی ہے۔ اسی عظیم المرتبت ذات کی بندگی کی وجہ سے ہم خود بین بھی ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ یعنی ہمیں صرف آزادی فکر و عمل ہی کی توفیق نہیں ملی اس آزادی فکر و عمل کو پوری طرح نگاہ میں رکھنے کی توفیق بھی عطا ہوئی ہے۔ ہماری خود بینی کسی قسم کی کم درجہ یا پست درجہ خود غرضی سے تعلق نہیں رکھتی۔ اسی طرح ہماری اس خود بینی کا تعلق کسی گھٹیا قسم کی نخوت سے بھی نہیں ہماری یہ خود بینی تو اعلیٰ قسم کے فخر و نظر سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم آزاد ہونے کے ساتھ جو خود بین ہیں تو

اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنے آپ پر کڑی نگاہ رکھنا بھی آتا ہے۔ ہم نے اپنے آپ کے نگہبان و محافظ بھی ہیں۔ اور جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں ہماری حسرت لگرو عمل اور پھر اس حسرت لگرو عمل پر ہماری نظر یہ سب کچھ صدقہ اس قادر مطلق کی بندگی کا ہے جس نے ہمیں اپنے بندہ ہونے کے ساتھ ساتھ آزاد و خود بین ہونے کی توفیق بھی عطا فرمائی ہے۔

پھر کیا چاہئے؟

ہم نے تو زہد خشک زہد خشک کی رٹ لگا کر زہد و تقویٰ کو ایک ایسی چیز بنا کر رکھ دیا جس کا آج کے جدید انسان بلکہ ہمیشہ کے جدید انسان یعنی گوشت پوست کے انسان سے کوئی تعلق ہی باقی نہیں رہ گیا۔ بھلا دیکھئے تو سہی یہ بھی کوئی عقل کی بات ہوئی کہ آپ دنیا کی مزید اور چیزوں دلچسپ چیزوں دلربا اور دلچسپ چیزوں کی طرف توجہ ہی نہ دیں ان کو خاطر ہی میں نہ لائیں۔ ایک طرف کو منہ کئے ہوئے روٹھے روٹھے زندگی گزار دیں۔ اصل میں یہ ساری باتیں خلاف فطرت ہیں ان لئے اسلام نے بہانگ دہل اعلان کر دیا کہ لا رہبانہ فی الاسلام۔۔۔۔۔ ترک دنیا تو اسلام میں ہے ہی نہیں۔

زہد و تقویٰ یا پرہیزگاری کا فلسفہ کیا ہے؟ بغور دیکھا جائے تو آدمی بزم خویش ترک دنیا یا ترک لذات دنیا اس لئے کرتا ہے تاکہ اسے اگلی زندگی میں ان سے بھی بہتر چیزیں حاصل ہوں۔۔۔۔۔ گویا آدمی اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے اس طرح کے نام نہاد زہد و تقویٰ کی مصیبت اپنے سرمول لیتا ہے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سرے سے آدمی اچھی چیزوں کا قائل ہی نہ

ہو۔۔۔۔۔ دنیا کی ساری لذتیں سارے مزے سارے آرام و آسائش آدمی کے لئے ہی تو ہیں۔ تمام خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب آدمی ان چیزوں کے حصول میں اعتدال کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔ بظاہر تو خواہش اور اعتدال کا کوئی ساتھ نظر نہیں آتا لیکن ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں نہ اعتدال کے بغیر خواہش کے قدم آگے بڑھتے ہیں اور نہ خواہش کے بغیر اعتدال کوئی معنی رکھتا ہے۔ اعتدال اور خواہش کے اس مقام یا سنگم کو حاصل کرنے میں آدمی نے بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اعتدال کا گلا گھونٹ کر آدمی افراط و تفریط کا شکار ہوتا رہتا ہے اور خواہش کا گلا گھونٹنے کی تو خیر آدمی میں آج تک ہمت نہیں ہوئی اور یہ ہمت ہوتی بھی نہیں چاہئے کہ خواہش ہی تو آدمی کے آدمی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ وہ کیا آدمی ہے اور کیا انسان ہے جو کوئی خواہش نہیں کرتا بلکہ جو شخص سب سے زیادہ خواہشات رکھتا ہے اس میں اتنی ہی زیادہ انسانیت اور آدمیت ہوتی ہے۔

غالب نے انسان کی اسی خواہشات سے لبریز فطرت کے پیش نظر اپنے ایک شعر میں زہد و تقویٰ کو ترغیبات کا ایک ہنرماند کی ترغیب دلائی ہے۔ یا تدبیر پیش کی ہے۔۔۔۔۔ بخور دیکھا جائے تو زہد و تقویٰ اور پرہیزگاری خواہشات یا ترغیبات دنیا کو ترک کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ ان کو اپنے قابو میں کرنے اور قابو میں رکھنے کا نام ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی زہد اور پرہیزگار ہے تو خواہشات اور ترغیبات دنیا سے وہ اتنا ہی واقفیت کے ساتھ دست و گریبان ہوتا ہے یا خواہشات اور ترغیبات کو اپنے قبضہ قدرت میں رکھتا ہے۔ ایک بچہ زہد اور پرہیزگار شخص پر خواہشات اور ترغیبات واقعات کے طور پر وارد ہوتی ہیں جن کو وہ یعنی پرہیزگار شخص خیالات کی صورت میں ذہن کر اپنی امان کے

خزانے میں بے ہمتی و گوبرینا کر محفوظ کر لیتا ہے جو اس کی آخرت ہی میں کام نہیں آتے اس دنیا میں بھی کام آتے ہیں۔ غالب کا کیا سادہ کیا پہلی کیا عمدہ کیا قیامت خیز اور قیامت بردوش شعر ہے۔۔۔۔۔

چاہئے اہموں کو جتنا چاہئے

یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہئے

اس شعر میں ہندی کے ایک لفظ اچھا سے غالب نے اس قدر فائدہ اٹھایا ہے جس کی ہم کسی طرح بھی کھل کر داؤ نہیں دے سکتے۔ اچھا یا اچھائی دراصل مجموعہ ہے انسان کے ظاہری اور باطنی حسن و جمال کا۔۔۔۔۔ جب ہم کسی کو اچھا آدمی کہتے ہیں تو ہمارا ذہن فوراً اس کی باطنی خوبیوں کی طرف جاتا ہے۔ لیکن دوسرے لمحے ہی بلکہ اس سے بھی پہلے اس شخص میں ہمیں ظاہری خوبیاں بھی نظر آنے لگتی ہیں۔ اور بول ہمیں ایک اچھا آدمی ظاہر و باطن کی نسبت سے ہمیں دنیا کی اچھی چیزوں میں بھی ظاہر و باطن کے یہ جلوے اپنا حضور فرماتے محسوس ہوتے ہیں۔ جس چیز کو ہم اچھا کہتے ہیں پھر وہ ظاہری ہی میں نہیں باطن میں بھی ہمیں اپنے لئے اچھی لگتی ہے۔

اصل میں زاہد اور پرہیزگار آدمی کی نفسیات یہ ہے کہ وہ دنیا کی چیزوں کے ظاہری ترغیبات سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے۔ اگر کسی زاہد اور پرہیزگار آدمی کو کسی چیز کے بارے میں یہ پتا چل جائے کہ وہ چیز باطن میں خوب ہے تو وہ یعنی زاہد کسی طرح بھی اس چیز سے اپنا دامن نہیں بچائے گا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ زاہد اور پرہیزگاری قریب اور دھوکے سے بچنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔۔۔۔۔ ورنہ آپ جانتے ہیں اچھی چیزوں کے لئے رغبت نہ رکھنا

عموہ حیرت مند اور تیز و طرار اشارے سے دیتا ہے کہ ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب تک ہم زندگی کے کون سے کنارے پر کھڑے اپنے آپ سے غافل ہو گئے تھے۔ اور زندگی کے اس طرح بالا مال ہونے کا ہمیں احساس کیوں نہیں تھا۔

اور یہ صرف اشارہ ایک بہت ہی چھوٹا سا اور معمولی سا لفظ ہے اور وہ لفظ ہے "یہ"۔۔۔۔۔ حالانکہ غالب اس لفظ کے بجائے نہایت آسانی ایک دوسرے چھوٹا سا لفظ وہ بھی استعمال کر سکتا تھا چاہتے اچھوں کو بتانا چاہتے۔۔۔۔۔ وہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہتے۔ لیکن غالب نے وہ کے بجائے یہ استعمال کیا ہے۔۔۔۔۔ کیوں؟۔۔۔۔۔ اس لئے کہ لفظ وہ کے استعمال سے اچھے لوگ جن کو چاہتے رہنے کی دنیا میں ہر شخص کو آرزو ہے کہیں دور چلے جاتے۔۔۔۔۔ لیکن غالب نے لفظ یہ استعمال کر کے ہمیں بتایا کہ جن اچھے لوگوں کی ہمیں تلاش ہے وہ ہم سے دور نہیں ہم سے بہت ہی قریب ہیں اتنے قریب کہ ہم ان کو تانے کے لئے بڑے اطمینان سے کہہ سکتے ہیں وہ اچھے لوگ یہ ہیں۔۔۔۔۔ یہ کے استعمال نے ایک تو ہمارے آئیڈیل کو ہم سے قریب کر دیا دوسرے ہم پر یہ بھی واضح کر دیا کہ ان اچھے لوگوں میں بھی چاہنے کی خواہش سرگرم عمل ہے۔۔۔۔۔ مزید یہ کہ لفظ یہ کے استعمال نے ہم پر یہ بھی آشکارا کر دیا کہ اچھے لوگ کوئی خیالی چیز نہیں ہوتے ہمارے اور آپ کے درمیان ہی میں رہتے ہیں بس ہمیں آنکھیں کھول کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ کے بعد دوسرا لفظ "اگر" ہے جو ہمیں خامسا بھنجوڑتا ہے۔ یعنی بات صرف اسی سے نہیں بنتی کہ ہم اچھوں کو چاہتے چلے جائیں اس کے لئے ضروری ہے کہ اچھے لوگ بھی ہمیں چاہتے ہوں۔۔۔۔۔ گویا اچھے لوگ نہ صرف ہمارے قریب ہیں

وہ ہم پر پوری طرح نظر بھی رکھے ہوئے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں اچھے لوگوں کا وجود ایک امر مسلم ثابت ہو رہا ہے ایک بہت ہی بڑی اور خوبصورت نفوس حقیقت کے پیکر میں۔۔۔۔۔ جن کو ہم خواب و خیال کسی طرح بھی نہیں کہہ سکتے۔

لیکن یہاں ایک لطیف نکتہ ہے حد قابل غور ہے کہ جیسے ہی یہ اچھے لوگ ہمیں چاہنے لگتے ہیں چاہنے اور ترغیبات کا ایک پورا دور ایک جگہ ایک سرکل اپنی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔۔۔۔۔ یعنی یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہے۔۔۔۔۔ کے اعلان کے ساتھ ہی زہد اپنے ترک کی منزل پر پھر سے آجاتا ہے۔۔۔۔۔ اصل میں زہد کا مطلب بھی یہ ہے کہ اچھائیوں کو حاصل کرنے کے لئے کسی ترغیب کی کیا ضرورت ہے اچھائی کو خود بخود اس کے چاہنے والے کی طرف آنا چاہئے۔ جس طرح اچھائی کو ہم چاہتے ہیں اسی طرح اچھائی بھی ہمیں چاہے تب مزہ ہے۔ یوں دیکھا جائے تو زہد کے مزے صرف اپنے ہی انداز کے نہیں ہوتے عام مزوں سے کہیں زیادہ مزے کے یہ مزے ہوتے ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے اسی لیے ہم اس کو بار بار دہرا رہے ہیں کہ زہد کا مطلب یہ ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ آدمی اپنے آپ کو زندگی کی لذتوں اور آسائشوں سے محروم کر لے بلکہ زہد و تقویٰ کا مطلب تو یہ ہے کہ زندگی کی لذتیں اور آسائشیں ہمارے لیے لطافت اور استحکام کے ساتھ قابل قبول ہوں۔ ان میں زندگی کی تمام تر پاکیزگی اور اس کا تمام تر تقدس موجود ہو۔۔۔۔۔ زندگی کی کوئی لذت اور کوئی آسائش ہمارے لیے ایسی نہ ہو کہ وہ ہمیں تنگ دل اور تنگ نظر بنا کر رکھ دے۔۔۔۔۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں زندگی کی کسی لذت اور کسی آسائش کا اسیر ہو کر نہیں رہنا چاہئے۔۔۔۔۔ اس لیے غالب کہہ رہا ہے چاہئے اچھوں کو بہتا چاہئے۔۔۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ چاہئے کی اصل لذت اور اصل آسائش وہی ہے کہ جو ہمارے قدموں کو کہیں بھی رکھنے نہ دے۔۔۔۔۔

اصل ایماں

غالب کا ایک بہت ہی مشہور شعر ہے جس کو ہم ابھی آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اس شعر میں غالب نے ایک طرح سے ایمان کی تعریف کی ہے اور ہمیں یہ بتایا ہے کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے۔ اصل میں ایمان ہے کیا چیز؟۔۔۔۔۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ غالب کی سخن دہری کا ہریہ ہے کہ وہ اپنے شعر کے ایک ایک لفظ کے قریب قریب تمام معانی کو اپنے ذہن میں رکھ کر شعر کہتا ہے اور پھر ان معانی کا دور دور تک تعاقب بھی کرتا ہے۔ اکثر شاعرین نے چونکہ غالب کے اس تعاقب پر نظر نہیں رکھی اس لئے وہ صحیح معنی میں غالب کی تفہیم اور تخریج نہیں کر سکے۔۔۔۔۔ جدید لسانیات تو اب بتا رہی ہے کہ کس طرح لفظ کے نیچے سے معنی سرک سرک جاتے ہیں اور کس طرح لفظ پھر بھی ان معانی کو اپنی تحویل میں رکھتا ہے۔ میرا مطلب ہے غالب اس علم لغات سے پہلے ہی وجدانی طور پر واقف تھا۔ وہ معانی پر محض دسترس ہی نہیں رکھتا تھا انہیں اپنی معانی کو تخلیق کرنا بھی جانتا تھا۔ تخلیق معانی گزشتہ معنی کو سیاق و سباق کے ذریعہ فروغ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ اپنی جگہ رہتا ہے اور

محافی آرام سے اوھر اوھر ہوتے رہتے ہیں۔ پہلے وہ شعر سماعت فرمائیے جس پر مجھے بحث کرنا ہے۔

وقاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے

مرے بت خانے میں تو کہیے میں گاڑو برہمن کو

غالب اس شعر میں کہتا ہے کہ ایمان کی اصل ایمان کی حقیقت مضبوط

وقاداری ہے یعنی ایسی وقاداری جو آخر وقت تک قائم و دائم رہے۔ اور

وقاداری کیا ہے آپ جانتے ہی ہیں کسی ایک کا ہو کر رہنا اپنی پوری زندگی کو

کسی کی رضا کے سپرد کر دینا۔۔۔۔۔۔ انگریزی میں اس کو Commitment

کہتے ہیں۔ اور وفادار دار Committed کہلاتا ہے۔ اسی طرح کسی ایک کا ہو

کر رہنا آدمی کو کیا فائدہ پہنچاتا ہے؟۔۔۔۔۔۔ اس کا جواب بھی غالب لفظ ایمان

کے لغوی معنی کے ذریعہ ہم پر واضح کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ ایمان کے لغوی معنی ہیں

امن و امان اور عافیت سے رہنا۔ گویا جب ہم کسی ایک کے ہو کر رہتے ہیں تو

ہماری ذہنی پریشانی ختم ہو جاتی ہے۔ اور پھر جس ایک کے ہم ہو کر رہتے ہیں وہ

جتنی بڑی ہستی کا مالک ہو گا اسی قدر زیادہ ہم ذہنی طور پر امن و امان اور عافیت

سے رہیں گے اور ظاہر ہے جب ذہنی طور پر ہمیں اطمینان ہو گا تو ہماری سوچنے

کی جملہ صلاحیتیں بھی صحیح معنی میں کام کریں گی یعنی ہم صحیح طور پر سوچیں گے

ہماری فکر میں کوئی کچی پیدا نہ ہوگی اصل میں صحیح معنی میں حریت فکر اور آزاد

خیالی بھی آدمی کو اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ ذہنی طور پر امن و عافیت

سے ہوتا ہے۔ اور اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ اگر ہم صحیح طور پر

سوچیں گے تو ہمارے اعمال میں بھی سچائی رہی ہی رہے گی۔ اور ہم دنیا میں شر

اور فساد کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ اور یہ تو آج کے ماہر نفسیات ڈنگ مرحوم

نے بھی کہا ہے کہ صحت مند ذہن قرب الہی کا مظہر ہوتا ہے۔ اگر آپ کا ذہن صحت مند ہے تو آپ کسی ذہنی خللشار کا شکار نہیں ہوں گے اور جب آپ کسی ذہنی خللشار کا شکار نہ ہوں گے تو آپ تک دلی تک نظری سے بھی بچے رہیں گے۔ صحت مند ذہن ہی اچھی اچھی اونچی اونچی باتیں سوچتا ہے اور یوں وہ رب العالمین کی قربت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آپ سوچ رہیں ہوں گے غالب نے وفاداری کے ساتھ استواری یعنی پختگی اور استحکام کی شرط تو لگا دی لیکن یہ متعین نہیں کیا کہ کس کے ساتھ مضبوط قسم کی وفاداری ضروری ہے۔۔۔۔۔۔ جی ہاں اگر غالب ایسا کر دیتا تو ایک طرح وہ حرمت فکر سے فرار کا مرتکب ہو جاتا۔ اور اصل ایمان بھی واضح نہ ہو پاتی۔ غالب تو اصل ایمان کے بارے میں ایک کلیہ پیش کر رہا ہے کہ آپ کسی بھی ایک کے ہو کر دیکھ لیجئے آپ کے ذہن میں یکسوئی اور عافیت پیدا ہو جائے گی باقی یہ آگے کی بات ہے کہ یہ عافیت اور اطمینان کتنے دیر برقرار رہتے ہیں کیونکہ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے جس قدر بڑی ہستی سے آپ کی وابستگی ہوگی اسی قدر آپ ذہنی طور پر امن و امان اور عافیت سے رہیں گے۔ چنانچہ اس مسئلہ کو غالب نے شعر زیر بحث کے دوسرے مصرع میں اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔۔۔۔۔۔ اگر کوئی برہمن اپنی زندگی پوری وفاداری کے ساتھ بت خانے میں گزار کر مر جاتا ہے تو وہ ایک مومن ہو کر مرا ہے اس کو کعبہ میں دفن کرنا چاہئے۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ تو ہم نے مصرع کا مفہوم بیان کیا ہے ذرا اس کے اصل الفاظ پر غور فرمائیے۔ مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاؤد برہمن کو۔۔۔۔۔۔ مرنے کے ایک معنی فدا ہونا بھی ہوتے ہیں۔ اور وفاداری کے حوالے سے تو فدا ہونے کا مفہوم اور بھی واضح ہے۔ گویا برہمن نے اپنی پوری زندگی وفاداری اور فداکاری میں بت

خانہ میں رہ کر گزار دی اور یوں اسے ایک طرح ذہنی عافیت حاصل رہی جو کہ ایمان کی اصل ہے۔ یعنی اس طرح دیکھا جائے تو برہمن کی ساری زندگی ایمان واری میں گزری اس لئے اس کو کہیے میں گاڑنا چاہئے۔ اب دیکھئے غالب نے سسکرت کے لفظ گاڑنے سے کس قدر معنوی فائدہ اٹھایا ہے۔ سسکرت میں گاڑا کے معنی چھپانے اور گھات میں بیٹھنے کے ہیں۔۔۔۔۔ گویا برہمن نے یوں تو اپنی دانست کے مطابق پکی وقاداری کے ساتھ بت خانے میں اپنی ساری زندگی گزار دی اور آپ جانتے ہیں اشیات میں موت کے معنی بالکل ختم ہو جانے کے نہیں ہوتے۔ مذہب کا سب سے بڑا سچ یہی ہے کہ آدمی کی زندگی دنیا ہی میں ختم نہیں ہو جاتی اس کا سلسلہ تو بت آگے تک جاتا ہے لہذا یہاں مرنے کے معنی بقتل ہمارے میر صاحب کے ایک وقت کے ہیں یعنی ذرا غور و فکر سے کام لینے کے۔ برہمن کو مرنے کے بعد جب کہیے میں گاڑا جائے گا تو گویا اسے بت خانے پر گزاری ہوئی زندگی کا جائزہ لینے کے لیے موقع ملے گا وہ غور کرے گا میں نے وقاداری دکھائی جس کے صلے میں میرے ذہن کو بھی ایک اطمینان نصیب ہوا لیکن کہیے میں بیٹھ کر پتا چل رہا ہے کہ اصل وقاداری تو کعبہ کے ساتھ ہونا چاہئے تھی۔ اور یہ رب کعبہ کا الطاف و کرم اور فیاضی ہے کہ اس نے پھر بھی میرا احترام کیا مجھے قدر و منزلت کے ساتھ دیکھا اور مجھے اپنے ذہن کو وسعت دینے کا موقع دیا۔

غالب کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کے ضمن میں اصل چیز آپ کے ذہن کی صحت ہے۔ آپ کے ذہن کی یکسوئی اور اطمینان ہی وہ شے ہے جس کی وجہ سے آپ امن و عافیت میں رہتے ہیں اور پھر یہ ذہنی امن و عافیت ایسی قوی اور توانا کیفیت ہوتی ہے کہ اگر یہ حاصل ہو جائے تو پھر دنیا کے

”ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا“

اگر کوئی غالب کے ذوق الہیات سے دو چار ہونا چاہے تو اس کے لئے بھی غالب نے ایک تدبیر بتائی ہے اور وہ تدبیر مکالمہ ہے۔ یعنی اگر کوئی واقعی یہ معلوم کرنا چاہے کہ غالب کا ذہن الہیات کس قسم کا ہے تو اس کا آسان سا طریقہ یہ ہے کہ آپ غالب سے اس موضوع الہیات کے کسی پہلو پر گفتگو کر کے دیکھ لیجئے مگر بات یہ ہے کہ آپ گفتگو اس انداز میں کریں جو حق گفتگو کرنے کا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ شائستگی اور روشن خیالی کا دامن ہاتھ سے کسی طرح نہ چھوڑیں کچھ بحثی پر ہرگز نہ اتریں۔ جو بات ماننے کی ہے اسے مانتے جائیں جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کے متعلق سوالات کر کے گفتگو کو آگے کی طرف منت بڑھنے دیں۔ اگر آپ نے غالب کے ساتھ الجھنے کی کوشش کی اور آپ خواہ مخواہ کچھ بحثی پر اتر آئے یا محض اپنی انا کی جھوٹی تسکین کے لئے کوشاں ہوئے تو پھر آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ایسی صورت میں نہ آپ کچھ سمجھ پائیں گے اور نہ غالب ہی کی اصل شخصیت آپ کے سامنے آسکے گی۔ البتہ اگر آپ اپنے اس الجھنے پر کچھ عقل حوصلہ دکھائیں گے تو آپ کو غالب کے ظاہر اور باطن

کے ضمن میں بہت کچھ معلوم ہو سکے گا۔ لیکن اس کے لئے آپ کو آزلو خیال اور روشن ضمیر ہونا لازمی ہے۔ غالب کا وہ شعر جو ہم بحث کے لئے یہاں پیش کر رہے ہیں یہ ہے۔

دیکھو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ منافقت کے بارے میں جو عام مشہور ہے کہ منافق آدمی کا ظاہر اور باطن ایک نہیں ہوتا تو ایسی بات ہرگز نہیں ہے۔ منافقت میں یہی تو ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ظاہر اور باطن کو ایک ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہوتا ہے اب چونکہ یہ کوشش فی ضلہ غلط بنیاد پر مبنی ہوتی ہے اس لئے منافق آدمی کا نہ ظاہر اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور نہ باطن۔۔۔۔۔ یعنی منافقت میں آدمی اپنے ظاہر اور باطن دونوں سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔۔۔۔۔ اور وہی بات یہ محض اس لئے کہ آدمی کا ظاہر اور باطن ایک ہو ہی نہیں سکتا اگر ظاہر اور باطن ایک ہوتا تو اس کے لئے یہ دو لفظ کیوں بنائے جاتے۔۔۔۔۔ ظاہر ظاہر ہے اور باطن باطن۔۔۔۔۔ رہی اللہ کے بارے میں قرآن پاک کا یہ ارشاد کہ حوالہ ظاہر حوالہ باطن وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی تو یہ ظاہر و باطن کے ایک بہت بلند مقام کی بات ہے جہاں تضادات ختم ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔ ہم تو یہاں روز مرہ زندگی کا ذکر کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ اور اس روز مرہ زندگی کے حوالے سے انسان کی صورت حال کا جائزہ لے رہے ہیں۔

ہاں تو ہم غالب کے اس شعر کے بارے میں بات کر رہے تھے جس میں غالب نے لوگوں کو اپنی شخصیت سے متعلق خبردار کیا ہے۔۔۔۔۔ اور بڑے

زور دار انداز میں خبردار کیا ہے۔ کہ دیکھو غالب سے الجھنے کی کوشش نہ کرنا غالب کے یہاں کوئی منافقت نہیں ہے وہ بہت صاف اور کھرا آدمی ہے۔ وہ جس طرح خود الجھا ہوا آدمی نہیں ہے اسی طرح وہ اپنے مخاطب کو بھی الجھا ہوا دیکھنے کا عادی نہیں۔۔۔۔۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب کوئی اس سے یعنی غالب سے الجھتا ہے تو پھر غالب کی شخصیت اس کے سامنے آجاتی ہے۔۔۔۔۔ اور غالب کی شخصیت کیا ہے یہی کہ اس کا باطن اپنی جگہ پر قائم ہے اور ظاہر اپنی جگہ پر۔۔۔۔۔ جس طرح عام انسان کی شخصیت کے ظاہر اور باطن ایک دوسرے میں گنڈھ ہوتے ہیں غالب کے ساتھ اس طرح کا معاملہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ انسانی کردار میں کسی نہ کسی طرح سے منافقت در آتی ہے اس کو روکنا صرف مشکل کام ہی نہیں ہے بہت نازک کام بھی ہے اس لئے جو شخص کسی انسانی معاشرہ میں متعلق نہیں ہے سمجھ لیجئے وہ کردار کے لحاظ سے بہت بڑا آدمی ہے۔ باطن اپنی جگہ صاف ستر رہے اور ظاہر اپنی جگہ آشکار اس کے لئے آدمی کو بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔ انسان کے باطن کو سنبھالنا ایک طرح پوری خدائی کو سنبھالنا ہے اور انسان کے ظاہر کو سنبھالنا پوری کائنات کو سنبھالنے کے مترادف ہے۔

انسان اپنے ظاہر کو سنبھالتا ہے تو ڈھنگ کے نظریہ ہم عصری کے مطابق اس کی نظر اپنے پرے ماحول کی ایک ایک چیز پر ہوتی ہے اور پھر صرف اس کی نظری نہیں ہوتی وہ اس شے یا اس چیز کی حیثیت کو بھی برقرار رکھتا ہے۔ یعنی اس چیز پر کیوں اور کیا کا کوئی حکم نہیں لگاتا اس چیز کو بیکارہ استدلال ہو کر دیکھتا ہے مگر اس کے معنی کو سمجھتا ہے۔ مثلاً صبح کے دس بجے ہیں میں اپنے کمرے میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا ہوں۔ کھڑکی میں سے درخت پر بیٹھی ایک فاختہ

کو کو----- کر رہی ہے----- ذرا دور سڑک پر سے گاڑیاں گزر رہی ہیں
آسمان پر ہاول چھائے ہوئے ہیں----- یہ سب کچھ ایک ہی وقت میں ہو رہا
ہے ان سب واقعات کی اپنی اپنی وجوہات ہیں لیکن پورے ماحول کی کوئی ایک
وجہ نہیں ہے میں اپنی کیوں لور کیا سے اس پورے ماحول کو ڈسٹرب Disterb
نہیں کر سکتا۔ لیکن میں اس ماحول میں جو معافی رواں دواں ہیں ان کو محسوس
ضرور کر سکتا ہوں----- ملیت سے بلند ہو کر معنی کو جانتا اور محسوس کرتا یہ
ڈنک کا نظریہ ہم عصری ہے----- خارج کو اس طرح بیگانہ استدلال ہو کر
دیکھنا اس طرح اخلاص کی راہ پر چل کر مشاہدہ کرنا آدمی کو کفر کی عجیب عجیب
خزولوں سے آشنا کرتا ہے۔ بقول غالب آدمی کھل کر کافر ہوتا ہے تو اس کو چپکے
سے ولایت کا درجہ مل جاتا ہے----- کھل کر کافر ہونا غالب کی نظر میں
خارج کو ایک خاص بصیرت اور ویژن کے ساتھ دیکھنے کے درجات عطا کرتا
ہے۔ یعنی اس طرح کا کافر خارج پر حتی الوسع پوری پوری نظر رکھنے کی سعی کرتا
ہے۔ اور واضح ہے کہ جب آدمی خارج کو اس طرح دیکھے گا تو اس کو اپنے
باطن کی بے شمار سچائیوں کا عرفان ہو گا۔----- خارج کو ہر خلوص ہو کر دیکھنے
سے انسان کو اپنے باطن کی حقیقت کا پتا چلتا ہے۔ انسان کا باطن تمام کا تمام
روحانیت سے لبریز ہے لیکن اس روحانیت کا انکشاف اس وقت تک ممکن نہیں
جب تک انسان خارج کے بہت سے التباسات بہت سے دھوکوں سے ڈٹ کر
انکار نہ کرے یعنی دھوکوں سے انکار کرنا ان کے ساتھ کافر ہو کر ملاقات کرنا
اصل میں سچائی کو جی ہاں باطن کی صداقت کو پوری طرح سامنے لانے کے ہم
معنی ہے۔----- اور جیسے ہی باطن کی صداقت سامنے آتی ہے آدمی کو حسب
توفیق ولایت کا درجہ مل جاتا ہے۔

غالب نے اپنے ہاٹن کو ظاہر کے وسیلے سے جانا اور اپنے ظاہر کو ہاٹن کی معرفت سے پہنچانا۔۔۔۔۔ اسی لیے غالب بیک وقت ایک سچا اور کھرا کافر بھی ہے اور ایک سچا اور کھرا ولی بھی۔۔۔۔۔ غالب کی ولایت پوشیدہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس نے اپنے ظرف کو چھلکنے نہیں دیا۔۔۔۔۔ انسان کا ظرف چھلکنے کے لئے بتا ہی نہیں ہے وہ تو مسلسل بھرنے کے لئے بتا ہے۔۔۔۔۔ اور اس بھرنے کا معاملہ زمان و مکان سے کیسے بلند ہے۔۔۔۔۔ حالانکہ یہ ظرف خود ایک زمان و مکان کا مالک ہے یا زمان و مکان اس کی تحویل میں ہوتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں ہر لفظ ایک علامت ہے اور علامت کی تعریف یہ ہے کہ یہ مسلسل معانی کی نشاندہی کرتی رہتی ہے تو غالب نے الفاظ سے جی ہاں طرح طرح کی علامات سے اپنے فنِ سخن وری کے ذریعے مکالمہ بھی کیا ہے اور مجاہدہ بھی۔۔۔۔۔ اسی بات کو اس نے اپنے مندرجہ ذیل شعر کے حوالے سے واضح کیا ہے۔۔۔۔۔ میں اس شعر کو بار بار اس لئے پیش کرتا چلا آرہا ہوں کہ یہ شعر غالب کے کلام کو سمجھنے میں سب سے زیادہ مددگار ثابت ہوتا ہے اور میں نے بھی اس شعر کی روشنی ہی میں غالب کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے آگے میری بھی کوئی بساط نہیں اور نہ ہی میرا کوئی دعویٰ ہے۔ میں تو غالب کی جبرودی میں غالب کے شعروں کے الفاظ کے تعاقب میں نکل پڑتا ہوں۔۔۔۔۔ بس یہ ہے تفہیم غالب کے ضمن میں میری تمام تر سعی۔۔۔۔۔ تو وہ مشہور شعر اور بار بار بیان کیا ہوا شعر یہ ہے۔۔۔۔۔

مختبینہ معنی کا ظلم اس کو سمجھئے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

لفظ مختبینہ معنی کا ظلم اسی وقت ہوتا ہے جب آپ اس کو ایک علامت

سمجھ کر اس کا تعاقب کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ تعاقب بہت ہی دلچسپ مشغلہ ہے۔۔۔۔۔۔ اس لئے غالب کی شاعری کے بارے میں جو کچھ میں نے لکھا ہے یا آئندہ میں جو کچھ لکھوں گا وہ قارئین غالب پر کوئی احسان نہیں ہے میں اپنی زندگی کو گل و گلزار بنا رہا ہوں۔ غالب کے کسی شعر کی تفسیم کے لئے الفاظ کے تعاقب میں لکنا کسی شکار کے پیچھے جانا یا کسی ہدف اور نشانہ کی طرف جانے سے کہیں بڑھ کر دلچسپ مشغلہ ہے۔ بلکہ شکار اور ہدف کو تو آخر میں آپ حاصل کر کے ایک طرح تسکین اور سکون حاصل کر لیتے ہیں غالب کے اشعار کی تفسیم کا سلسلہ تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اور آپ خود بھی نہیں چاہتے کہ یہ دلچسپ اور معنی خیز سلسلہ ختم ہو جائے۔ بس ایک دکھشی ہے دلہری ہے رعنائی اور زیبائی ہے جس کے پیچھے آپ مسلسل چلے جا رہے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔

آرائش جمال

آپ غالب کے ذوق الہیات کی اس سے بڑھ کر داد کیا دیں گے کہ اس نے یعنی غالب نے طبیعیات مابعد الطبیعیات جنیات 'نقیات اور جمالیات کو ایک شعر میں اس خوبصورتی اور نزاکت کے ساتھ سمو کر پیش کیا ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ شاعری کی زبان میں کس قدر وسعت اہلایہ ہے۔ کون سا شعبہ علم ہے جو اس میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ پھر تمام علوم کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے یعنی اصطلاحات جن کے بغیر ان کو سمجھنا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔ لیکن شاعری کی زبان پر اگر غالب کی طرح کوئی قدرت رکھتا ہے تو کون سا گمراہ سے گمرا اور وسیع سے وسیع تر مضمون ہے جو بیان نہیں کیا جاسکتا۔۔۔۔۔

دیکھ لیجئے مسئلہ ارتقاء طبیعیات اور مابعد الطبیعیات یعنی سائنس اور فلسفہ کا بہت اہم مسئلہ ہے اور قرآن پاک میں تو واضح طور پر ارشاد ہوا ہے۔۔۔۔۔ کل یوم ہو فی شان وہ ہر روز ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے۔۔۔۔۔ یہ عالم یہ کائنات یہ دنیا کس طرح ترقی پا رہی ہے۔ ایک مفکر نے

اس کو ایک بیج سے تشبیہ دی ہے جو رفتہ رفتہ نمو پذیر ہو کر تناور درخت بن جاتا ہے۔۔۔۔۔ ہمارے عظیم مسلم فلسفی ملا صدرا الدین شیرازی کا کہنا ہے کہ اصل حقیقت وجود Existance کی ہے۔ یعنی وہ اصل الوجود Primacy of existance کے قائل ہیں۔ لیکن یہ وجود ہر وقت حرکت میں رہتا ہے اور اس کی یہ حرکت ہی اس کو ارتقاء بخشتی ہے۔۔۔۔۔ وجود کی اس حرکت کو وہ حرکت فی الجوہر کہتے ہیں۔ اور یہ حرکت چونکہ ہمیشہ اوپر کی طرف ہوتی ہے۔ جس سے اشیاء میں ارتقاء بھی ہوتا ہے اور ان کی شناخت اور امتیاز بھی پیدا ہوتا ہے اس اصول کو وہ اصول تکلیک کہتے ہیں۔۔۔۔۔ اوپر گسساں کہتا ہے کہ زندگی میں آگے بڑھنے کا ایک ارادہ ایک توانائی کا جذبہ پایا جاتا ہے Elan Vital جس سے ہر وقت ارتقاء ظہور میں آتا ہے۔۔۔۔۔ اسی طرح ڈارون فوکس طبیعیات کے حوالے سے ارتقاء کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن ان تمام علوم کو ان تمام فلسفوں کو غالب نے کس روحانی کس ذہنی اور لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

آرائش جمال سے فارغ ضیں ہنوز

پیش نظر ہے آئندہ دائم نقاب میں

بظاہر تو اس شعر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حیدر اپنی نقاب کے پیچھے آئینہ لیے اپنے خدو خال کو بنا اور سنوار رہی ہے۔ لیکن ذرا غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ غالب نے کائنات کی اصل حقیقت کو ایک حیدر بنا کر پیش کیا ہے اور اسے مسلسل اپنے آپ کو بنانے سنوارنے میں مشغول کر کے یہ بتایا ہے کہ کس خوبصورتی اور دلچسپی اور نگاہ کے ساتھ کائنات کا ارتقاء ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ یعنی کائنات کے ارتقاء سے اس کی فطرت اور قدرت ایک لمحے کے لیے بھی

فاعل نہیں ہے۔۔۔۔۔

آرائش جمال کی ترکیب سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اس کائنات کی اصل جمال ہے یعنی حسن و خوبی جس کو ہر وقت مزید بنایا اور سنوارا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ اور اس بنانے اور سنوارنے یعنی آرائش کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ اس کائنات کے جمال کے امکانات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔۔۔۔۔ آپ اس دنیا کو جتنا چاہے بنا اور سنوار سکتے ہیں۔۔۔۔۔ اور آپ جتنا جتنا اس کو بناتے اور سنوارتے ہیں آپ کے ذوق جمال کا تقاضا اتنا اتنا ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔۔۔۔۔ نہ کائنات کے امکانات حسن و جمال کبھی ختم ہونے والے ہیں اور نہ ہی آپ کا ذوق و شوق کبھی ختم ہونے والا ہے۔۔۔۔۔

آپ نے شعر زیر بحث کی Image سے یہ بھی اندازہ لگایا ہو گا کہ زندگی کو بنانے سنوارنے اور کامیاب بنانے میں جنسیات کا کس قدر حصہ ہے۔۔۔۔۔ علوم کی بظاہر فحشگی کو اگر کوئی چیز قابل رشک بناتی ہے تو وہ نیکیس ہے۔۔۔۔۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو خود نیکیس کی کس قدر پاکیزگی اور تقدس ہے ہم اس کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ اور آپ نے یہ بھی اندازہ لگایا ہو گا کہ نیکیس انسان کی حریت فکر اور روشن خیالی کو کس طرح ابھارا ابھارتا اور مسلسل آگے بڑھنے کے لیے تیار کرتا ہے۔ حسن و جمال کی ممیز کے بغیر آدمی میں صحیح معنی میں حریت فکر اور روشن خیالی پیدا نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ نیکیس آدمی کی ذات پر حسن و جمال کے راز منکشف کرنے میں بہت بڑا رول ادا کرتا ہے۔۔۔۔۔

اب شعر زیر بحث کے ایک ایک لفظ کی طرف توجہ دیجئے۔۔۔۔۔
سب سے پہلی بات اس شعر میں قابل غور یہ ہے کہ اس میں فاعل کون ہے اس

کی طرف کوئی ذرا سا حرف اشارہ بھی ہمیں نہیں مل رہا ہے۔۔۔۔۔ آرائش
 جمال سے فارغ نہیں بنوز۔۔۔۔۔ کون فارغ نہیں؟۔۔۔۔۔ پیش نظر ہے
 آئینہ دائم نقاب میں۔ آئینہ ہر وقت کس کے پیش نظر ہے۔۔۔۔۔؟ فاعل کے
 نہ ہونے سے قاری کے ذہن کو غور و فکر کا ایک وسیع میدان مل جاتا ہے۔
 حقیقت الحقائق کے سارے صفات جمع ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔ جمال کے معنی
 آپ جانتے ہی ہوں گے حسن کثیر کے ہیں بہت زیادہ بے حساب حسن کے۔ اب
 اس بے اندازہ اور بے حساب حسن کو بنانے ستارنے میں جو ہستی مصروف ہو
 گی کوئی معمولی ہستی کس طرح ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ حسن بے اندازہ ہو ہے۔
 اس کے لیے نظم و ترتیب یعنی آرائش کی بھی ضرورت ہے۔ لہذا اس کی
 آرائش میں ہر وقت مصروف رہنا لازمی بات ٹھہرتی ہے۔ آپ جانتے ہیں لفظ
 فراغت سے فارغ ہے اور فراغت ضد ہے عمل کی گویا آرائش جمال سے بنوز
 یعنی ابھی تک فارغ نہیں مطلب یہ ہے کہ فراغت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں
 ہوتا۔ لفظ بنوز نے روز ازل سے لے کر آج تک کی مدت ہی کو اپنے احاطہ میں
 نہیں لے لیا ہے۔۔۔۔۔ مستقبل کو بھی گرفت میں لے رکھا ہے۔۔۔۔۔
 آئینے کا ہمیشہ سامنے ہونا یہ ثابت کر رہا ہے کہ آرائش کرنے والے کی نظر میں
 حیات و کائنات کے غدو خال کی باریک سے باریک اور لطیف سے لطیف صورت
 موجود ہے۔۔۔۔۔ اور یوں اس کے بصیر ہونے کا پتا چل رہا ہے۔ خیر ہونے
 کی گواہی بھی مل رہی ہے۔۔۔۔۔ اور یہ سب کچھ نقاب میں ہو رہا
 ہے۔۔۔۔۔ نقاب کے لفظ سے ہمیں یہ پتا چل رہا ہے کہ اس نقاب کو اٹھا بھی
 ہے۔۔۔۔۔ لیکن ابھی آرائش جمال کا عمل جاری ہے اور وہ بھی نقاب کے
 پیچھے جب ایسی صورت میں حیات و کائنات کے حسن و جمال کا یہ عالم ہے تو جس

وقت نقاب اٹھے گا تو اس وقت اس حسن و جمال کا کیا عالم ہو گا۔۔۔۔۔۔ فرض
 حیات و کائنات کے ارتقاء کی بھی کوئی امتنا نظر نہیں آ رہی ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن
 لمحہ موجود کو ساتھ لے کر ہمیں آگے بڑھنا ہے۔۔۔۔۔۔ حیات و کائنات ارتقاء
 پذیر ہے۔ اور وہ بھی دو شیزہ فطرت اور حینہ قدرت کے ہاتھوں۔۔۔۔۔۔ پھر
 اور کیا چاہئے؟ لیکن ہم مطمئن کہاں ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور ہم مطمئن ہوں بھی
 تو کیوں؟ ہم حیات و کائنات کے دشمن تو نہیں جو اس کے ارتقاء کو روکنے کی
 سوچیں اور مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں۔۔۔۔۔۔ آرائش جمال کا دلربا منظر ہر وقت
 ہمارے سامنے ہے۔۔۔۔۔۔

باطن لہو لہان ہوا

زخم نے داؤ نہ دی غلجی دل کی با رب
 تیر بھی سینہ بیل سے پر المیوں نکلا
 حسب معمول غالب کے اس شعر کو بھی قدیم و جدید شارحین نے
 محبت اور عشق کے حوالے سے یاسیت اور حزن و ملال کا شعر ہی قرار دیا ہے۔
 حالانکہ ایسی بات ہرگز نہیں۔ غالب تو اس شعر میں انسانی نفسیات کے ایک اہم
 معاشرتی پہلو کی طرف ہماری توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ اور وہ انسان کی غلجی
 دل یعنی خبث باطن کا مسئلہ ہے۔ غلجی دل آدمی کو طرح طرح کے بھل کے لیے
 اکساتی ہے اور بھل کے ذریعے آدمی سمٹتا چلا جاتا ہے۔ خود غرضی "خود پسندی"
 کہیں پروری، بدخواہی، تعصب ایسی صفات ہیں جو آدمی میں عام ہو جاتی ہیں۔
 زندگی سزا کر جانور پن کے نقطے تک پہنچ جاتی ہے۔ زندگی کی تمام وسعتیں
 بلندیاں اور گہرائیاں یک دم آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ ایسی گندی
 گھٹاؤنی صورت حال سے نکلنے کے لیے غالب نے ایک تجویز پیش کی ہے جیسا کہ
 وہ اس شعر کی تفسیر کے طور پر لکھتا ہے۔ "میں نے یہ ایک بات اپنی طبیعت

جاتا ہے کہ وہ کس تک جگہ پر آکر پہنچ گیا ہے۔

اس شعر میں غالب جس قسم کی جکڑ تراشی کرتا ہے اور جس طرح کی ایجری ہمارے سامنے آتی ہے، شارحین نے اس طرف بالکل توجہ نہیں دی۔ یا رب! زخم نے تنگی دل کی دلوں نہ دی یعنی اس زخم سے تنگی دل دور نہیں ہوئی بلکہ اس تنگی دل نے خود تیر کو پریشان کر دیا اور وہ دل سے اس طرح پھڑپھڑاتا ہوا نکلا جس طرح ایک پرندہ گھبرا کر کسی تک جگہ سے لگتا ہے۔ اس شعر کی تمام ایجری حرکت سے مملو ہے۔ شعر کو اس انگیزی اور محرومی کی تصویر کہنا غالب کے ساتھ سراسر غلط اور زیادتی ہے۔

غالب تو اس شعر میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہمارا غٹ باطن اس قدر سخت صورت اختیار کر گیا ہے کہ اب اس کو دور کرنے کے لیے کسی معمولی قسم کے آگے ضرب کی ضرورت نہیں بلکہ جس قدر یہ آگے ضرب مضبوط ہو گا، اسی قدر ہمارے دل کی تنگی دور ہوگی۔۔۔۔۔ غالب نے باطنی خیالوں کو دور کرنے کے لیے جس طرح اس شعر کے علاوہ دوسرے شعر میں تلوار کا ذکر تیر کے ساتھ کیا ہے وہ بھی کوئی کم قابل داد نہیں۔

نہیں ذریعہ راحت جراثیم

وہ زخم تنج ہے جس کو کہ دل کشا کہئے

اس کے علاوہ غالب نے یہاں باطن کو صاف کرنے، وسعت دینے اور

جلا بخشنے کے لیے جس طرح خارج کی عام اشیاء کو کار آمد قرار دیا ہے وہ بھی اپنی جگہ معمولی بات نہیں۔ زخم تنج کو دل کشا کہنا اور تیر کا سینہ نعل سے پرافشاں لگانا اپنے طور پر ایک اہمیت رکھتا ہے اور پھر شعر میں غالب ”یا رب“ کہہ کر جو فریاد کرتا ہے اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ اے پالنے والے! تو انسان کا اس قدر

خیال رکھتا ہے لیکن انسان اپنی تعاطل شعاری سے باز نہیں آتا۔ تو انسان کو وسعتیں بخشا ہے اور انسان اپنے لیے تنگیاں پسند کرتا ہے۔ اپنے آپ کو کم حوصلہ، کم دل، کم نظر کھلا کر اور بنا کر زیادہ خوش ہوتا ہے۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو ”یا رب“ کے الفاظ بھی انسان کو اس کی وسعتوں اور پسائیوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہی بات کہ اے پالنے والے! تو انسان کو پوری پوری وسعتوں اور پسائیوں کے ساتھ پرورش کرتا ہے، پالتا ہے لیکن انسان اپنے آپ کو گنہگار رکھنے میں ہی ایک طرح کی ہلاکت آفریں سولت محسوس کرتا ہے۔ غالباً وہ لاشعوری طور پر وسعتوں سے خوف زدہ رہتا ہے۔

لیکن غالب نے زیر بحث شعر میں ایک بہت ہی معنی خیز نکتہ بیان کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی کا باطن ہی گھٹن کو ٹاپند نہیں کرتا، خواہر بھی گھٹن کو ٹاپند کرتے ہیں۔ یعنی مادی اشیاء بھی فراخی اور کشادگی کا تقاضا کرتی ہیں یا وسعت اور پھیلاؤ ان میں بھی موجود ہے۔ اسی بنا پر غالب اس شعر میں کہہ رہے ہیں کہ دل کے تنگ ہونے کا یہ حال تھا کہ اس میں تیر بھی جا کر گھبرا گیا اور وہ پھڑپھڑاتا ہوا باہر نکلا۔ گویا زندگی میں گھٹن کسی طرح بھی قابل قبول نہیں۔ اور باطن کی گھٹن تو ایسی بری چیز ہے کہ اس کو مادی اشیاء بھی قبول نہیں کرتیں، لیکن انسان ایک عجیب مخلوق ہے کہ وہ تنگ دل ہونے پر آماتا ہے تو اس میں بھی کمال دکھا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو غالب کا زیر بحث شعر گھٹن اور تنگ دلی کے خلاف ایک بہت بڑا احتجاج ہے۔ ”یا رب“ کے الفاظ اس احتجاج کو مزید تقویت بخشتے ہیں اور اس کی شدت کا موجب بنتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم شاعرین کی ہمنوائی کرتے ہوئے اس شعر کو یا سیت یا حزن و ملال مجھول سے بھرا شعر کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ البتہ یہ شعر غالب کے ذوق امیات کو ضرور واضح کر رہا ہے اور ”یا رب“ سے تو اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

انتظامی تصور ایثار

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
 حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حسب معمول زبان کے اعتبار سے اور بیان کے اعتبار سے بھی غالب کا یہ شعر بہت عام فہم شعر ہے۔ عام فہم اس لئے بھی کہ اس شعر میں عوام کے شعور عدل سے کام لیا گیا ہے یعنی اس شعر کی منطق بہت عام فہم ہے۔ آپ یہ تو جانتے ہوں گے کہ عام آدمی کی سمجھ میں جو بات آتی ہے اس کی تفہیم بجلی کے کوندے کی طرح ہوتی ہے۔ ادھر بات زبان سے نکلی اور ادھر سمجھ میں آگئی۔ گویا عام آدمی اپنی سمجھ کو تیز و طرار ان معنی میں رکھتا ہے کہ وہ ابلاغ میں کسی الجھن کا قائل نہیں۔۔۔۔۔ لہذا شعر زیر بحث کا معنوی حسن اسی لئے چندے آفتاب چندے مانتا ہے کہ یہ شعر اپنے چہرے پر بظاہر کوئی نقاب نہیں رکھتا۔۔۔۔۔ سیدھی سی بات ہے کہ ہم نے اگر جان دے دی ہے تو کون سا کمال کیا ہے جان جس کی دی ہوئی تھی اسی کو واپس کر دی تو اس میں ہماری کون سی خوبی کردار شامل ہے۔

اب غالب کا اس شعر کے ضمن میں پہلا کمال یہ دیکھئے کہ عام سے الفاظ میں بظاہر عام سی بات کہہ کر ایک ذہین قاری کے لئے غور و فکر کا کس قدر بڑا خزانہ مہیا کر دیا۔۔۔۔۔ اور اس خزانے کا بڑا حصہ یہ ہے جو غالب پورے خزانے کے جواہرات پر بھاری ہے کہ اس شعر میں غالب نے قربانی اور ایثار کا جو عام تصور ہے اس کو ایک طرح سے جس جس کر کے رکھ دیا ہے یعنی قربانی میں سب سے بڑی قربانی جان کی قربانی کو سمجھا جاتا ہے۔ جس نے کسی کے لئے جان دے دی سمجھ لیجئے اس نے سب کچھ دے دیا۔ لیکن غالب تو یہ کہہ رہا ہے کہ جان دے کر آپ نے کونسا خیر مارا ہے۔ جان تو آپ کے پاس ایک امانت کے طور پر ہے آپ اسے تو کسی کو دے ہی نہیں سکتے۔ جب تک کہ آپ اس کی رضا حاصل نہ کر لیں جس کی عطا کردہ یہ آپ کی جان ہے۔ اور اگر ہم جان بچھٹے والے کی رضا حاصل بھی کر لیں پھر بھی خالی جان دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس طرح دیکھا جائے تو غالب نے آج تک جو پورے عالم انسانیت کے ذہن میں ایثار اور قربانی کا ایک بڑا تصور تھا اس کو قطعی طور پر بدل کر رکھ دیا ہے۔ ہم اب تک بھی سمجھتے آرہے تھے کہ جان سے بڑھ کر کوئی قربانی نہیں ہو سکتی۔ جس نے کسی کو یا کسی کے لئے جان دے دی یوں سمجھتے کہ اس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ لیکن غالب کا یہ کہنا ہے کہ جان دینا تو ایسا ہی ہے جیسے کسی کی دی ہوئی چیز اسی کو واپس دے دی یا اگر کسی اور کو دی تو گویا ایک طرح امانت میں خیانت کے مرتکب ہو گئے۔

جان کو ایثار کے منظر سے ہٹا کر غالب نے نفسیاتی طور پر ایک کمال یہ دکھایا ہے کہ جان کو آدمی ایثار کے ضمن میں جو ایک بہت بڑی چیز سمجھتا تھا اس

کو اس طرح سمجھنے کی وجہ سے وہ ایک طرح بزدل ہو گیا تھا۔ لہذا جان کے ضمن میں اب وہ اس طرح کا بزدل نہیں رہا۔ دوسرے لفظوں میں غالب نے انسان کو جان کے خوف سے نہات کیا دلائی ہے اس کو بہادر اور بلند حوصلہ کر دیا ہے۔ واضح رہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ غالب نے آدمی کی نظر میں اس کی جان کی وقعت کم کر دی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے آدمی جب کوئی بڑی سے بڑی قربانی دیتا ہے تو اس بڑی قربانی کے ساتھ جان کا جانا تو مقدر ہے لیکن قربانی میں صرف جان کا نذرانہ پیش کرنے سے جان کی وہ عزت و حرمت نہیں رہتی جو کسی چیز کے ساتھ جان کے جانے میں عزت و عظمت کی تعمیر و تکمیل ہوتی ہے۔

شعر ذیل بحث کے دوسرے مصرع میں غالب جو یہ اعلان کرتا ہے ”حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا“ تو اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ اگر آپ نے قربانی کے طور پر اور وہ بھی جان ایسی چیز عطا کرنے والے کی خدمت میں صرف جان پیش کر دی ہے تو یوں سمجھئے آپ نے ”حق تو یہ ہے“ کے مطابق کوئی سچی بات نہیں کی۔ دوسرے لفظوں میں آپ کی اس جان کی قربانی میں صداقت نہیں ہے۔۔۔۔۔ اور نہ ہی کوئی حق ادا ہوا ہے یعنی آپ نے اپنی ذمہ داری بھی پوری نہیں کی۔۔۔۔۔ بغور دیکھئے تو شعر ذیل بحث میں وہی بات کہ غالب آپ کے دل سے جان کا خوف دور کر رہا ہے۔ جان کے بارے میں آپ کو کچھ نرالے ہی انداز کا ایک نصیحت معقول حوصلہ دے رہا ہے۔ یعنی جان دینے میں آدمی کو خالی پچھکے جذبات سے کام نہیں لینا چاہئے۔ جان دنیا تو ایک بہت ہی بڑی عقل مندی کی نشانی ہے۔ آدمی عقل مندی کے ساتھ جان دے تو پھر اس ایک جان کے بدلے میں اسے نہایت کتنی بے شمار جانوں کی طاقت و قوت حاصل

گویا اس طرح جان دینے والے نے زندگی میں کوئی ایسا کام ہی نہیں کیا جس کو
 وہ اپنی اس جان کے شکر یہ میں پیش کر سکتا۔ غالب کے اس شعر کو اچھی طرح
 سمجھنے والا کبھی یہ نہیں کہہ سکتا جیسا کہ عام لوگ جذبات میں آکر کہہ اٹھتے ہیں
 میں اپنی جان آپ کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔۔۔۔۔۔ یا میں اپنی جان آپ پر
 قربان کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔ گویا اس شعر میں غالب نے ہمیں اپنی جان کی حفاظت
 کرنے کا ایک اچھوتا انداز بتایا ہے۔ اور ہمارے لئے نظم و ضبط کا ایک بانٹل نیا
 منظر تخلیق کیا ہے۔۔۔۔۔۔ جس کو دیکھ کر اگر ایک طرف ہم اپنی جان کی حفاظت
 کر رہے ہیں تو دوسری طرف اس لمحے ہم اپنی جان کو قربان کرنے کی کونکوں
 تیاریوں میں بھی مصروف نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔۔

غم خوار جان دردمند

جراحت تخذ الماس ارمغان داغ بگرہ
 مبارک باد اسد غم خوار جان دردمند آیا

یہ ایک شعر ہے جو متداول اردو دیوان غالب کی پہلی غزل کے بعد
 اور دوسری غزل سے پہلے ہمیں ملتا ہے۔۔۔۔۔ اس شعر کا موضوع انسان کی
 دوسرے انسان کے ساتھ غم خواری دکھانا یا دوسرے انسان کے غم میں شریک
 ہونا یا اس کا دردمند ہونا ہے۔ یہ موضوع جس قدر روزمرہ زندگی سے تعلق
 رکھتا ہے اسی قدر نازک اور لطیف بھی ہے۔ آدمی کا کسی دوسرے آدمی کے غم
 میں شریک ہونا بہت مشکل اور نازک کام ہے لیکن اس کے بغیر معاشرتی زندگی
 کے تقاضے بھی پورے نہیں ہوتے۔ یعنی آدمی کسی کا غم خوار نہ بھی بننا چاہے تو
 اسے بننا پڑتا ہے۔ بڑی حد تک یہ اس کی مجبوری ہے۔ مگر آدمی کی انسانیت کا بچا
 بھی اسی وقت صحیح معنی میں چلتا ہے جب وہ کسی دوسرے کے غم میں شریک ہوتا
 ہے۔ لہذا غم خواری میں آدمی کو بے حد ذہانت دکھانے کی ضرورت
 ہے۔۔۔۔۔ غالباً اسی لیے حضرت علیؑ نے فرمایا ہے النود نصف العقل ملنا

طرح چھپ کر کام کرتی ہے۔ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ہمیں اپنے سرگرم عمل ہونے کا پتا دیتی ہے۔ گویا جس طرح جن ہماری آنکھوں سے او جھل جوتے ہیں اسی طرح ہماری جان بھی ہماری آنکھوں سے او جھل جوتی ہے۔ جب کہ بدن میں ساری چھل پھل اور دھوم دھام اسی ایک جان کی وجہ سے ہے۔۔۔۔۔ ہمارے فعال ہونے کا منبع ہماری جان ہی تو ہے۔۔۔۔۔ وہ ہمارے جسم کو طرح طرح کے سکھ آرام اور عیش و عشرت کے سامان بھی تو فراہم کرتی ہے۔ دودھ اور شہد کی نمریں قسم قسم کے پھل یہ سب نو بہ نو خواہشات کی صورت میں ہمیں مہیا کرتی ہے۔ تازہ بہ تازہ خواب دکھاتی ہے۔ عمدہ سے عمدہ خیالات سے ہمیں سرفراز فرماتی ہے۔ گویا ایسی جان جو ہمارے لئے بے شمار کیفیات کے خزانے ہمیشہ ہمارے سامنے لا رکھتی ہے اور پھر ہم پر اس طرح کے ان گنت احسانات کرنے کے بعد ہمارے درود الم میں بھی برابر کا شریک رہتی ہے۔ اس جان کا غم خوار ہونا کوئی معمولی کام نہیں۔ یقیناً ”غم خواری ایک شاندار عمل ہے جس کے لئے ایک ذہین انسان کو دوسرے ذہین انسان کے لئے سراپا شعور“ سراپا دردمند بننا پڑتا ہے۔

غم خواری کی اسی شان و شوکت کے پیش نظر غالب نے شعر زیر بحث کے پہلے مصرع میں ایک عظیم الشان اور طرحدار فضا قائم کی ہے جو ہزار طنزیہ ہونے کے باوجود اپنی معنویت کو پورے تڑک و احتشام کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہے۔

جراحت خفہ الماس ارمغان داغ جگر ہدیہ

جراحت یعنی زخم کا خفہ اور الماس یعنی ہیرے کا ارمغان اپنی جگہ

لیکن داغ جگر کے ہدیہ کی بھی داد دیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔۔۔۔۔ اس میں

کوئی شک نہیں جب بھی کوئی ناصح بن کر ہمیں نصیحت کرتا ہے تو ہمارے غم کو
 سمجھنے کے بجائے الٹا ہمیں اوجھڑا دھڑکے بے معنی باتیں ہی بتاتا ہے۔ جس سے
 ہمیں ایک طرح زخم پہنچتا ہے۔ اور پھر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی اس زخم کو
 ہر ادا کرنے کے لیے یہ ناصح صاحب کوئی نہ کوئی ایسی بات بھی کہہ جاتے ہیں جو
 ہمیں مسلسل تکلیف پہنچاتی رہتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف وہ ہمارے
 لیے وہ وقت ہوتا ہے جب ناصح صاحب ہماری ہمت اور ہمارے حوصلہ پر حملہ
 آور ہوتے ہیں اور یہ فرماتے ہیں یا یہ بھی کوئی پریشان ہونے کی بات ہے
 حوصلہ اور ہمت رکھو بزدلی دکھانے کی ضرورت نہیں ڈٹ کر اس غم کا مقابلہ
 کرو۔ گویا اس طرح یہ ناصح صاحب ہمیں داغ جگر ہدیہ کے طور پر پیش کرتے
 ہیں۔ لفظ ہدیہ میں ہدایت کے پہلو پر غور کیا جائے تو غالب کے شعور بلاغت کی
 مزید داد دینا چڑتی ہے۔۔۔۔۔ ناصح صاحب نے ہم سے غم خواری کیا فرمائی ہم پر
 بزدلی اور بے حوصلگی کا الزام عائد کر دیا۔ گویا اگر ہم آپس میں بھیر سوچے سمجھے
 غم خواری فرمائیں تو اس طرح دوسرے کی غم خواری کے بجائے اس کو تکلیف
 ہی پہنچاتے ہیں۔۔۔۔۔ لفظ ہدیہ میں چھپی ہوئی ہدایت کو غالب نے داغ جگر
 کہہ کر ہمارے سامنے ایک نئی نفسیاتی صورت حال پیش کر دی ہے جس کے
 بارے میں ہم اکثر بے خبر رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس جان کو جو جن کی
 طرح ہمارے جسم میں کام کرتی ہے اور جنت کی طرح ہمارے لیے معنوی
 آسائش حیات بہم پہنچاتی ہے ہم اس کی غم خواری سے اپنی شعوری صلاحیتوں کو
 ایک طرف رکھ کر کس طرح عمدہ برآہو سکتے ہیں؟ غم خواری تو ہم سے پوری
 توجہ کی طالب ہے اور اسی توجہ سے انسانی ہمدردی اور مروت کے سرچشمے
 پھوٹتے ہیں جن سے اگر انسان فیض یاب ہو ناسیکہ جائے تو اس کے لاکھوں دکھ

درد اپنا مداوا خود تلاش کر لیں۔۔۔۔۔ اور یہ دنیا ہی جنت کا نمونہ بن جائے۔۔۔۔۔ اس طرزِ شعر میں غالب کا ذوقِ الہیات اپنا ایک الگ ہی رنگ دکھا رہا ہے جس کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے خود ہمیں اپنے ذوقِ الہیات کو ایک الگ کشادہ قلبی اور وسعتِ فکر کے ساتھ سنوارنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ اور پھر یہ سب کچھ غالب کے ایک ایک لفظ پر "غور" کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔



مصطفیٰ شکر حسین یادو

پیشینا غالب کے قارئین مجھ سے اتفاق کریں گے کہ میرے
شکر حسین یادو یا غالب شمس پیرا ابھی تک کوئی دوسرا
نظر نہیں آیا۔ اور میں یہ بات ابھی بلا خوف تردید کہہ سکتا
ہوں کہ غالب کے ذوقِ الہیات پر اس طرح کی تصنیف
ابھی تک اردو یا کسی دوسری زبان میں نہیں ملے گی۔
مشکر حسین یادو کا تحقیقی اور تحقیقی شعور کچھ اپنے ہی
انداز کا ہے۔ میں نے ان کی شاعری کا برملا نقد و تحلیل
بھی اس سے قبل شائع کیا ہے بشکر حسین یادو شاعری
میں ابھی ایک منفرد اسلوب کے مالک ہیں۔ اگرچہ وہ
پبلک ریلیشننگ کی پروا نہیں کرتے مگر ان کے قارئین
انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ غالب کا ذوقِ الہیات؟
غالبیات میں ایک ایسا اضافہ ہے جس کی داغ بیل قد
دی جانے کہ ہے۔ میں یہ بات ایک ناظر نہیں ایک
قاری کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔

ذوالفقار علی شفیق

علمِ نثر و ادب کے جدید ترین آغاز سے غالب کو سمجھنے
سمجھانے کے ضمن میں شکر حسین یادو نے اپنی اس
مخلص اور خیال انگیز کتاب میں غالب کی شاعری کے
ایسے ایسے نو گونے معنی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے کہ
ان کو معلوم کر کے آپ حیرت والا ایک عجیب معرکہ انگیز
حیرت سے دوچار ہونا چاہتا ہے۔۔۔ دراصل شکر حسین یادو
نے شعرِ غالب کی باطنی ساخت کو ہم پر آشوب کیا ہے
اور بتایا ہے کہ فنِ شاعری میں ایک ایک لفظ کا گہرا
شعور رکھتے ہوئے غالب کس طرح اپنے قاری کو سمجھ
غیر کی گونا گوں آفاق نگہانے کی قدت و مہارت
کا حامل ہے۔

جیسلمانی کامران